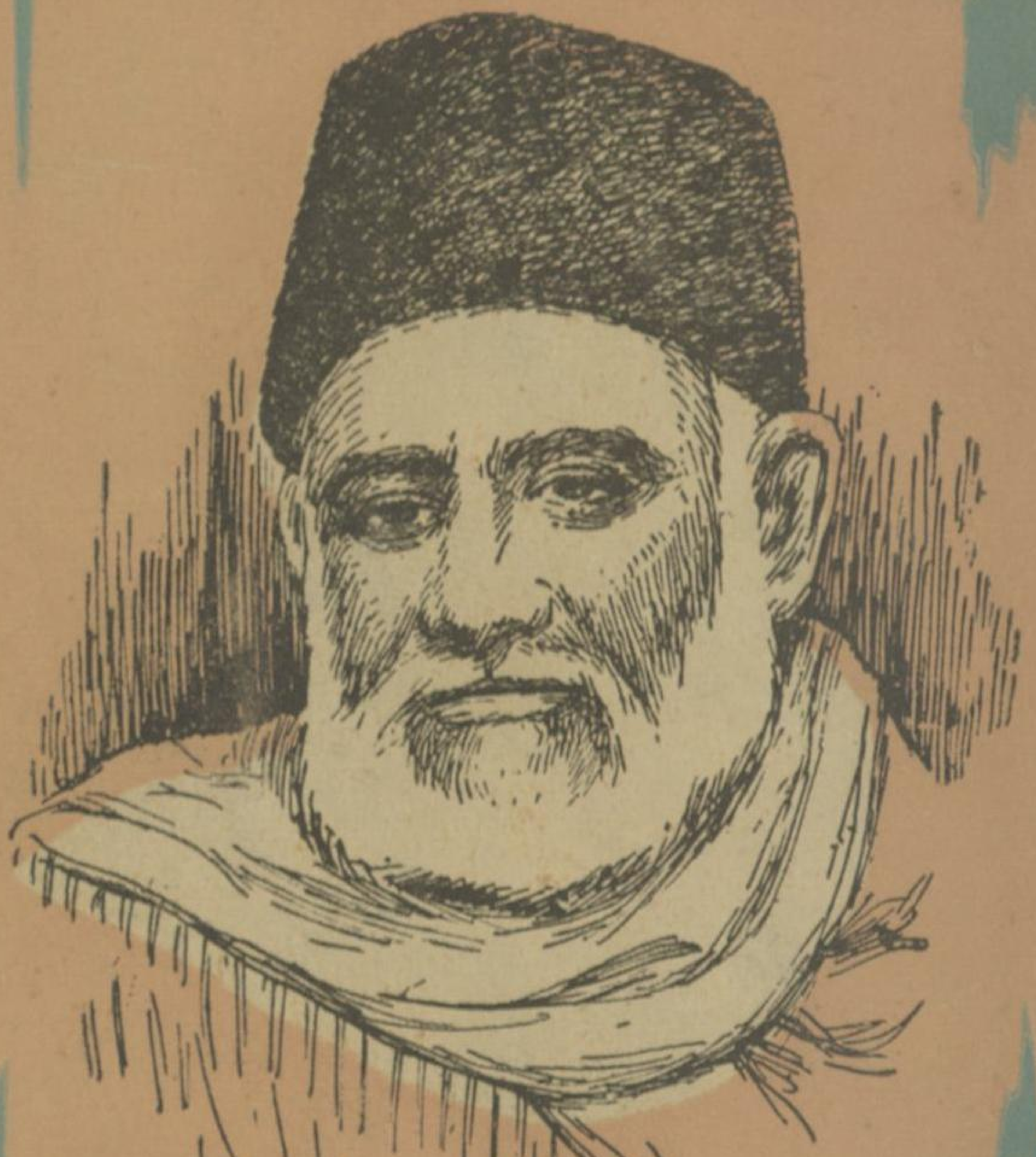
شبلی بحیثیت مورخ



اختر وقار عظیم

تصنیفات — لاہور

طبع اول : دسمبر ۱۹۶۸ع

ناشر : اطہر وقار ، ناظم تصنیفات ، لاہور

طابع : سید اظہارالحسن رضوی

مطبع : مطبع عالیہ ، لاہور

تعداد : گیارہ سو

قیمت : بارہ روپے

تصنیفات ، لاہور
آریہ سماج بلڈنگ ۱۰۲ - گنپت روڈ ، لاہور

ملنے کا پتہ :

۱ - اردو مرکز ، گنپت روڈ لاہور
۲ - منصور بک ہاؤس ، کچہری روڈ لاہور

اپنے ابا کے نام
جن کی ذات میرے فکرو خیال کا سرچشمہ ہے -

ترتیب

اختر وقار عظیم

پیدائش :

دہلی ۴ - اپریل ۱۹۴۶ء

تعلیم :

بی - اے ، گورنمنٹ کالج ، لاہور ۱۹۶۵ء
(آر - ایس مہتہ ، چنی لال گولڈ میڈل)
ایم - اے (تاریخ)
پنجاب یونیورسٹی ، لاہور ۱۹۶۷ء

مشاغل :

افسر تحقیق : ہسٹاریکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ،
پنجاب یونیورسٹی ۶۸ - ۱۹۶۷ء
رکن مجلس ادارت (اعزازی) : ماہنامہ "مجلس" لاہور

تصنیفات (مطبوعہ/زیر طبع) :

۱ - شبلی بحیثیت مورخ
۲ - مرزا اوٹ پٹانگ ، آردو مرکز لاہور
۳ - آردو میں تاریخ نویسی (سرسید سے شرر تک)
۴ - شبلی بحیثیت سیاست داں
۵ - تاریخ نویسی کا فن

6. Constitutional Development in Middle East.

۷ - سچے دوست ، بہادر دشمن (ترجمہ)
[مصنفہ : رابرٹ کینیڈی]

دیباچہ

میں اکابر کی تعریف میں ، کبھی کبھی مبالغہ بھی کرتا ہوں لیکن شبلی کے سلسلے میں یہ کہنا مبالغے میں شامل نہیں کہ انیسویں صدی میں جن تین چار بزرگوں کے نام ممتاز ترین کی فہرست میں شامل ہیں ان میں شبلی کو کسی دوسرے سے نیچے نہیں رکھا جا سکتا اور بعض خص شعبوں میں تو انہیں یکتائی کا اعزاز حاصل ہے ۔

آج سے تیس سال قبل جب میں نے سر سید کے رفقائے کار کے حالات اور کارناموں کا مطالعہ کیا تو میں نے محسوس کیا کہ شبلی جیسے افراد صدیوں کے بعد ظہور میں آتے ہیں ۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

(میر)

تاریخ ، سوانح عمری ، علم کلام ، ادب ، تاریخ ادب ، تنقید ، شاعری ، سیاسی تبصرہ نگاری ، مضمون نگاری ، تعلیمی تبصرہ نگاری ۔ ان فنون میں سے ہر ایک میں شبلی امتیازِ کامل کے مالک نظر آئے ۔ قدیم روایت کی نئی تعبیر اور نئی پیش کش تو ان کا کارنامۂ خاص معلوم ہوا ۔

ایک لحاظ سے شبلی خوش قسمت آدمی تھے کہ انہیں سید سلیمان جیسے شاگرد ملے۔ ان شاگردوں نے شبلی کے کام کی

قدر و قیمت پر بہت کچھ لکھا ۔ اس طرح شبلی کے بارے میں ہماری معلومات مستند ذرائع سے زندہ رہیں لیکن ایک دوسرے اعتبار سے شبلی بد قسمت بھی تھے ۔ یہ اس بنا پر کہ لوگوں نے انھیں سرسید کا حریف سمجھ لیا اور اس اساس پر ، یا تو ان کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کیں یا پھر ان کے رتبے کو بے حد گھٹا کر پیش کیا ۔ چنانچہ شبلیات کا خاصا حصہ اسی رجحان کے مطابق وجود میں آیا ہے ۔

اس پس منظر میں اختر وقار عظیم صاحب کی یہ کتاب جس پر میں دیباچہ لکھ رہا ہوں ایک قابل قدر کوشش ہے ۔ اس میں شبلی کے بارے میں جچے تلے محاکمے سامنے آ گئے ہیں ، یہ شبلی کے فنون کے متعلق عمدہ تجزیہ ہے اور شبلی کے رتبے کے تعین میں عموماً غیر جانبداری کا اظہار کیا گیا ہے ، مصنف کی بعض آرا سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اختلاف کے باوجود مصنف کی رائے کو وقعت دینی پڑتی ہے ۔

کتاب پانچ ابواب میں منقسم ہے ۔ پہلے باب میں تاریخ نویسی کے فن سے بحث کی گئی ہے ۔ دوسرا باب شبلی کے فن سے متعلق ہے ۔ اس میں ضمناً یہ بحث بھی شامل ہے کہ شبلی کو مورخ بنانے میں علی گڑھ نے کیا کردار ادا کیا ۔ تیسرا باب شبلی کی سوانح عمریوں پر ہے جس میں یہ جائزہ لیا گیا ہے کہ شبلی کی سوانح عمریاں ، فن تاریخ نویسی کے معیار پر کہاں تک پوری اترتی ہیں ۔ چوتھا باب شبلی کی تاریخی واقعات سے متعلق شاعری پر ہے اس میں یہ بحث کی گئی ہے کہ شاعری اور تاریخ نویسی کے فنون کے درمیان حائل فاصلوں کے باوجود شبلی نے اپنے شعروں میں کہاں تک تاریخ نویسی کے تقاضوں کو پورا کیا ہے ۔ پانچویں باب میں شبلی کے ہم عصر مورخین

سے ان کا موازنہ کر کے یہ جائزہ لیا گیا ہے کہ انھیں اردو کا مورخ اول کہنا کہاں تک درست ہے۔

ان سب بحثوں میں، مصنف نے محنت اور غور و فکر سے کام لیا ہے اور بالعموم بحث کا انداز علمی رکھا ہے، مجموعی لحاظ سے اسے شبلی کا داخلی مطالعہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ شبلی کے بارے میں شبلی کی کتابوں ہی سے استناد کیا گیا ہے اور شبلی کے اقوال سے شبلی کے موقف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

انداز بیان کی یہ خصوصیت بھی قابلِ توجہ ہے کہ مصنف نے عام قارئین اور خصوصی علم والے صاحبوں کو بیک وقت مد نظر رکھا ہے۔ چنانچہ یہ کتاب ہر کسی کی سمجھ میں آ سکتی ہے اور ہر کوئی اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔

مجھے امید ہے کہ اردو ادب کے قارئین اس کتاب کو خوش آمدید کہیں گے۔ اور مصنف کی محنت کی داد دیں گے۔

سید عبداللہ
(پروفیسر ایمریطس)
سابق پرنسپل اورینٹل کالج
لاہور

المامن۔ اردو نگر
ملتان روڈ، لاہور
۱۳۔ اکتوبر ۱۹۶۸ع

عرضِ مصنف

"پسند اپنی اپنی، خیال اپنا اپنا -" ہمارے یہاں اس قول نے ایک اصول ، ضابطے اور ایک قاعدے کی حیثیت اختیار کر لی ہے - اسی پسند اور اسی خیال کو ہم نے اچھے برے کی پرکھ کا پیمانہ ، معیار اور کسوٹی بنا لیا ہے - اس رویے کو عام معاشرتی زندگی میں خواہ کتنا ہی درست کیوں نہ سمجھا جائے لیکن علمی دنیا میں اس کا استعمال کسی طرح بھی مناسب نہیں - لیکن ہمارے یہاں یہ بات ایک مستقل رواج بن گئی ہے کہ ہم اپنی ذاتی پسند اور ذاتی رائے کی بنیاد پر بعض اوقات بڑی سے بڑی بات اور بڑے سے بڑا دعویٰ بڑے وثوق اور پورے اعتماد سے کردیتے ہیں - یہ دعویٰ حقیقت سے خواہ کتنا دور ہی کیوں نہ ہو کہنے والا کہتا ہے اور سننے والے سوچے سمجھے بغیر آمنّا صدّقنا کہتے ہیں اور اس دعوے کو صحیح تسلیم کر لیتے ہیں - اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب کہنے والا دیکھتا ہے کہ سننے والوں نے بغیر حیل و حجت اس کی بات مان لی ہے تو وہ اپنی عادت کو مستقل رویے کی شکل دے دیتا ہے -

کچھ یہی حال شبلی کے سلسلے میں ہوا - کہنے والے نے انھیں "اُردو کا مورخ اول" قرار دیا اور سننے والوں نے کہا "بےشک" نہ ادھر کسی اعتراض کی گنجائش تھی نہ ادھر کچھ کہنے

کی ضرورت ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم انہیں ''اردو کا مورخ اول'' کہتے رہے لیکن ان کے فن کی چھان پھٹک کر کے آن کے مرتبے کے تعین کی ضرورت کسی نے محسوس نہ کی ۔چنانچہ آج تک گنتی کے دو ایک مضامین کے علاوہ ''مورخ شبلی'' پر کچھ نہیں لکھا گیا اور اگر کچھ لکھا بھی گیا ہے تو محض سرسری انداز میں اور صرف دو چار سطروں میں ۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو موجودہ کتاب اس نوعیت کی پہلی کوشش ہے ، جس میں بہ حیثیت مورخ ، شبلی اور ان کے فن کا جائزہ لیا گیا ہے ۔ کتاب کے پہلے باب کا موضوع تاریخ نویسی کا فن ہے جس میں تاریخ نویسی کی فنی ضروریات ، مقتضیات اور اصول بتائے گئے ہیں ۔ دوسرا باب شبلی کی تاریخ نویسی کے فن سے متعلق ہے ، جس میں یہ بحث بھی شامل ہے کہ شبلی کا علی گڑھ اور علی گڑھ تحریک سے کیا تعلق تھا اور اس تعلق نے انھیں مورخ بنانے میں کیا حصہ لیا ۔ تیسرے باب میں فنی اعتبار سے شبلی کی سوانح عمریوں کا جائزہ لیتے ہوئے اس بات کی تحقیق کی گئی ہے کہ ان کی لکھی ہوئی سوانح عمریوں کو تاریخی تصانیف قرار دینا کہاں تک درست ہے اور یہ کہ یہ سوانح عمریاں تاریخ نویسی کے فن پر کس حد تک پوری اترتی ہیں ۔ اس باب میں یہ بحث بھی شامل ہے کہ شبلی یورپی مورخوں سے متاثر تھے یا نہیں ؟ چوتھا باب ، شبلی کے ان شعری کارناموں پر مشتمل ہے ، جن کا تعلق تاریخ سے ہے ۔ اس باب میں شاعری اور تاریخ نویسی کے درمیان حائل فاصلوں پر نظر رکھتے ہوئے یہ جائزہ لیا گیا ہے کہ ان فاصلوں کے باوجود شبلی اپنے شعروں میں تاریخ نویسی کی فنی ضروریات کو پورا کرنے میں کس حد تک کامیاب رہے ۔ پانچویں اور آخری باب میں شبلی

کا ان کے ہم عصر مورخین سے موازانہ کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انھیں "اردو کا مورخ اول" کہنا کسی حد تک درست ہے۔

شبلی کی تاریخ نویسی پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے وقت، مجھے جہاں شبلی کے بعض معتقدوں کی باتیں سننے کا موقع ملا وہاں بعض ایسے معترض بھی ملے جو شبلی کو سرے سے مورخ ہی تسلیم نہیں کرتے اور اپنے اعتراض کے لیے دلیل اس بات کو بناتے ہیں کہ جو تاریخ کسی مقصد کو سامنے رکھ کر لکھی جائے اُسے تاریخ ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔

مجھے اس اعتراض سے قطعاً اتفاق نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کا کوئی بھی کام، خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو اُس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک کام کرنے والے کے سامنے کوئی مقصد نہ ہو۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ کسی کام کے اچھے، برے ہونے کا تعلق اس مقصد کی نوعیت سے ہوتا ہے۔

اس خیال کی روشنی میں شبلی کی تاریخ نویسی کا جائزہ لیجیے۔ تاریخ لکھتے وقت شبلی کے پیش نظر دو باتیں تھیں، یا یوں کہیے کہ ان کے سامنے دو مقاصد تھے۔ اول تو یہ کہ وہ کسی طرح ان غلط فہمیوں کو دور کریں جو غیر مسلم مورخین نے مسلمانوں کے خلاف پھیلا رکھی تھیں۔ یہ بات کسی صورت بھی شبلی کے خلاف نہیں جاتی، کیونکہ فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ ایک اہم کام تھا۔ شبلی تاریخ کو کوئی نیا رنگ نہیں دے رہے تھے بلکہ وہ غلط انداز میں پیش کی ہوئی تاریخ کی تصحیح کر رہے تھے اور یہ بات بلا شبہ تاریخ نویسی کے بنیادی تقاضوں میں سے ایک ہے۔

ظاہر ہے اس مقصد کو دلیل بنا کر شبلی کو بحیثیت مورخ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری بات جسے شبلی کی مقصدیت کہا گیا ہے، یہ ہے کہ وہ شکست خوردہ ہندوستانی مسلمانوں کو ان کے آبا و اجداد کی عظمت کی داستانیں سنا کر وہ احساس کمتری دور کرنا چاہتے تھے جو جنگِ آزادی میں شکست کھانے پر ان کے دلوں میں پیدا ہو گیا تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ تاریخ لکھتے وقت شبلی نے کبھی اپنے اس مقصد کو نظر انداز نہیں کیا، لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ انھوں نے کبھی اس مقصد کو حقائق پر فوقیت نہیں دی۔ چنانچہ اگر انھوں نے کہیں اس مقصد کو پورا کیا بھی ہے تو حقائق کا سہارا لے کر اور حقیقت حال بیان کر کے۔ ان کے یہاں کہیں ایسا نہیں ہوا کہ انھوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے تاریخ کی مقتضیات کو نظر انداز کیا ہو۔ چنانچہ ان کے تاریخی کارناموں میں شاید ہی کوئی مثال ہو جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ شبلی اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے تاریخی حقائق کو قربان کر رہے ہیں۔ اس صورت میں بھی ظاہر ہے کہ انھیں تنقید کا نشانہ نہیں بنایا جا سکتا۔ وہ بلاشبہ ایک بڑے مورخ اور ایک ایسے بڑے مورخ تھے جنھوں نے بالعموم تاریخ نویسی کے لوازم اور فنی ضروریات کو نظر انداز نہیں کیا۔

مورخ شبلی کے فن پر ملنے والے مواد کی کمی کی وجہ سے مجھے جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اُن کا ذکر یہاں ضروری نہیں معلوم ہوتا البتہ اُن اصحاب کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جن سے ان مشکلات کے دور کرنے میں مدد ملی اور جن کی محبت اور شفقت یہ کتاب لکھنے کے دوران میں

مختلف مراحل پرشامل حال رہی - بزرگوں میں ڈاکٹر عبدالحمید صاحب ، ڈاکٹر رضی واسطی صاحب ، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی صاحب اور سید معین الرحمن صاحب کا شکریہ خاص طور سے واجب ہے کہ وہ اپنی مصروفیات کے باوجود قدم قدم پر برابر میری رہنمائی فرماتے رہے۔ معین صاحب کو خاص طور پر میں نے اتنا پریشان کیا کہ اب وہ میرے منہ سے شبلی کا نام سننے کے بھی روادار نہیں -

ضیا احمدرضوی صاحب اور افسررضوی صاحب کا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے کبھی مجھے میری سست رفتاری کا احساس نہیں ہونے دیا بلکہ اپنی سستی کے عملی مظاہروں سے مجھے برابر میری تیز رفتاری کا احساس دلاتے رہے ، ورنہ ممکن ہے جلدی میں اس کتاب میں کچھ اور غلطیوں کا اضافہ ہو جاتا -

میں اپنے بڑے اور چھوٹے بھائیوں انور وقار اور اطہروقار کا بھی شکر گزار ہوں کہ ان دونوں کو میری خاطر لاہور کی مختلف لائبریریوں کے پیہم چکر کاٹنے پڑے -

اپنی بہنوں کا شکریہ اس لیے لازم ہے کہ گھر بھر میں ادھر اُدھر بکھری ہوئی میری کتابیں اور کاغذ پھیلے دیکھ کر وہ کبھی مجھ سے زیادہ نہیں لڑیں !

آخرمیں سید اظہارالحسن رضوی صاحب کا شکریہ واجب ہے کہ انھیں کے دم سے یہ کتاب اتنی جلدی زیور طبع سے آراستہ ہوئی -

اُن بزرگوں کی شفقتوں اور عنایتوں کا احسان مند ہوں جنھوں نے اپنی آرا عطا فرما کے ہمت افزائی فرمائی -

لاہور ۲۵ ستمبر ۱۹۶۸ع **اختر وقار عظیم**

حسنِ خیال

جناب پیر حسام الدین راشدی
جناب احمد ندیم قاسمی
پروفیسر شیخ عبدالرشید
ڈاکٹر سید رضی واسطی
جناب علی عباس حسینی
پروفیسر سید احتشام حسین
پروفیسر محمد طاہر فاروقی
ڈاکٹر عبادت بریلوی
ڈاکٹر احسن فاروقی
ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی

جناب پیر حسام الدین راشدی

اختر وقار عظیم کے مقالے "شبلی --- بحیثیت مورخ" کا ایک حصہ دیکھا خوب ہے، کیا کہنا اس حصے سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنے موضوع کو دیانت داری اور پوری تحقیق کے ساتھ نباہا ہو گا۔

ہمارے ہاں تحقیقی کام کرنے والوں کی بڑی مانگ اور ضرورت ہے لیکن تن آسانی نے سب کو مار ڈالا اور ساتھ ہی علم کو بھی ختم کر دیا۔ اختر وقار عظیم جیسے نوجوان جب نظر آتے ہیں تو مایوسی امید میں بدل جاتی ہے۔

○

جناب احمد ندیم قاسمی

شبلی کی تاریخ نویسی ہمارے اہل علم کے گہرے غور و فکر اور تجزیہ و تبصرہ کی مستحق ہے۔ نوجوان ادیب، اختر وقار عظیم نے آگے بڑھ کر اس ذمہ داری کو سنبھالا ہے اور حق یہ ہے کہ انھوں نے شبلی کی تصانیف اور اپنی ذہانت کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے۔

پروفیسر شیخ عبدالرشید

[سابق صدر شعبۂ تاریخ ، مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ
صدر شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی]

شبلی کی مورخانہ حیثیت پر اختر وقار عظیم کی کتاب انیسویں صدی کے اردو مورخین پر دستیاب ہونے والے قلیل ادب میں خوش آئند اضافہ ہے۔

اختر صاحب نے شبلی کی تحریروں اور شبلی سے متعلق سینکڑوں کتابوں ، مضمونوں اور سفر ناموں کے مواد کو بڑی احتیاط اور ذہانت سے استعمال کیا ہے انھوں نے خلوص اور دیانت داری سے واقعات کا جائزہ لے کر ، انھیں سیدھے سادے انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی زبان صاف اور شستہ ہے اور مورخ کے فرض کو سمجھتے ہوئے انھوں نے اپنے بیانات و دلائل کو بے جا رنگینی و عبارت آرائی سے پاک رکھا ہے۔

○

پروفیسر سید رضی واسطی

[صدر شعبۂ تاریخ ، گورنمنٹ کالج ، لاہور
ڈائریکٹر ہسٹاریکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پنجاب یونیورسٹی]

اردو میں تاریخ نویسی کے فن پر لکھی جانے والی کتابوں کی کمی ہی نہیں ، کال ہے۔ اختر وقار عظیم کا مقالہ "شبلی بحیثیت مورخ" اس کمی کی تلافی کرے گا۔ انھوں نے اس تحقیقی مقالے میں جس تحقیق و جستجو ، غیر جانب داری اور توازن و اعتدال سے کام لیا ہے ، وہ ان کے مستقبل میں ایک بڑے مورخ اور نقاد بننے کی بڑی واضح اور روشن دلیل ہے۔

○

جناب سید علی عباس حسینی

مولانا شبلی نعمانی بڑے اچھے خطیب ، متکلم ، انشا پرداز، ناقد ، با بصیرت عالم ، شاعر و سخن فہم مورخ ، سوانح نگار و سیرت نویس ہونے کے ساتھ ساتھ ندوۃ العلما ، لکھنؤ اور دارالمصنفین ، اعظم گڑھ کے بانی بھی تھے ۔ انھوں نے شعرالعجم اور موازنۂ انیس و دبیر لکھ کر اردو ادب کی اور مختلف سیرتیں اور سوانح حیات لکھ کر اسلامیات کی بہت بڑی خدمت کی ہے ۔ انھیں بات کو سلجھا کر اور سمجھا کر کہنے کا خاص سلیقہ تھا ۔ وہ اردو نثر کے عظیم فنکاروں میں تھے ۔ ان کی ہمہ جہت و با کمال شخصیت پر مختلف پہلوؤں سے کام کیا جا سکتا اور داد تحقیق دی جا سکتی ہے ۔

اختر وقار عظیم نے علامہ شبلی کی مورخانہ حیثیت پر جو کام کیا ہے وہ بہت سی خوبیوں کا حامل ہے ۔ اختر وقار عظیم کی نظر وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ عمیق بھی ہے اور وہ ہر بات تول پرکھ کر لکھتے ہیں، چونکہ وہ خود ایک دیانتدار مورخ ہیں اس لیے وہ اس کمزوری کا شکار نہیں ہوتے جو مدح سرائی اور جنبہ داری کے ضمن میں آتی ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی یہ پُر از معلومات تصنیف ہماری تاریخی تنقید میں ایک مستقل اضافہ ثابت ہو گی ۔

پروفیسر سید احتشام حسین

[صدر شعبۂ اردو ، الہ آباد یونیورسٹی]

اگر ترجموں کو نظر انداز کر دیا جائے تو اردو میں تاریخی ادب کا سرمایہ بہت زیادہ نہیں ہے تاہم جو کچھ ہے وہ محققوں کی نگاہِ توجہ کا مستحق ہے۔ تحقیقی جائزے کے بعد ہی مستقبل میں تاریخ نویسی کا خاکہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔ بڑی خوشی ہے کہ اختر وقار عظیم نے اس دلکش موضوع کو اپنایا ہے اور سب سے پہلے مولانا شبلی کے تاریخی کارناموں پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے اور شبلی کے اصول تاریخ نویسی کی بنیادیں تلاش کی ہیں۔

شبلی اردو ادب میں تاریخ کے 'معلم اول' تھے یا نہیں یہ بحث ہو سکتی ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا شمار اردو کے اہم ترین مورخوں میں کیا جائے گا۔ انھوں نے تاریخ نویسی کا ایک ایسا معیار قائم کیا جس پر ابھی تک کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں کیا جا سکا ہے۔ اختر وقار عظیم نے بڑی تاریخی اور ادبی بصیرت سے شبلی کی اس حیثیت کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور ایسا کرنے میں انھوں نے ناقدانہ دیانتداری سے کام لیا ہے۔

پروفیسر محمد طاہر فاروقی

[صدر و پروفیسر زبان اردو و علوم پاکستانی ، انقرہ یونیورسٹی ، ترکی]

اختر وقار عظیم کی کتاب ''شبلی بحیثیت مورخ'' اپنے موضوع پر پہلی مخلصانہ اور دیانت دارانہ کوشش ہے -

اس کتاب کو پڑھ کر شبلی کی تاریخ نگاری کے سب پہلو آئینے کی طرح روشن ہوجاتے ہیں اور ہمیں کسی ایک جگہ بھی احساس نہیں ہوتا کہ لکھنے والے نے رائے کے اظہار میں جانبداری سے کام لیا ہے - مورخ شبلی کی تاریخ نگاری کا جائزہ اسی طرح لیا گیا ہے جیسے کہ ایک غیر جانبدار مورخ کو لینا گرا چاہیے - یہ کتاب بلا شبہ اردو کے تنقیدی سرمائے میں ایک نقدر اضافہ ہے -

○

ڈاکٹر عبادت بریلوی

[صدر شعبۂ اردو ، پنجاب یونیورسٹی]

شبلی کی پہلو دار شخصیت پر مختلف لکھنے والوں نے ، مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی ہے - لیکن ابھی تک اُن کی تاریخ نویسی پر خاطر خواہ کام نہیں ہوا ہے اور ایک مورخ کی حیثیت سے اُن کی شخصیت کے بہت سے گوشے ایسے ہیں جن کی نقاب کشائی اس وقت نہ صرف ادبی اور تنقیدی بلکہ ایک قومی اور ثقافتی تقاضے کی تکمیل ہے - اختر وقار عظیم نے شبلی کی تاریخ نویسی کا تفصیلی جائزہ لے کر اس اہم تقاضے کو پورا کیا ہے -

یہ کتاب ، نہ صرف اپنے موضوع کے اعتبار سے نئی ہے بلکہ نئی معلومات ، نئی ترتیب اور ایک نئے تجزیاتی انداز کی وجہ سے بھی پڑھنے والوں کے لیے دلچسپی کا سامان پیدا کرتی ہے -

ڈاکٹر احسن فاروقی

[صدر شعبۂ انگریزی ، سندھ یونیورسٹی]

شبلی کی تاریخ نگاری کے فن کا جس ہوشیاری ، ذہانت اور علمیت سے اختر وقار عظیم نے جائزہ لیا ہے وہ اردو تنقید میں بالکل نئی چیز ہے - شبلی کی اُن تصانیف کا مطالعہ جن کو عام طور پر سوانح کہا جاتا ہے مگر اصل میں وہ تاریخ ہیں ، اختر وقار عظیم کی وہ جدت طرازی ہے جو عام نقاد کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے - یہ تصنیف اُردو کی علمی تنقید میں بڑا گرانقدر اضافہ ہے -

○

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی

[صدر شعبۂ اردو ، لکھنؤ یونیورسٹی]

شبلی بحیثیت مورخ یہ مقالہ بہت اچھا ہے اور بڑے قاعدے سے معروضی انداز میں لکھا ہوا ہے۔ انداز بیان بھی صاف ستھرا اور مدلل ہے ، مجھے بہت پسند آیا -

○

تاریخ نویسی کا فن

"کسی بھی کام کو سلیقے سے انجام دینے کے لیے کچھ اصول اور قاعدے تشکیل دینا پڑتے ہیں، انہی اصولوں اور قاعدوں کے مجموعے کو فن کا نام دیا جاتا ہے۔

تاریخ نویسی کے لیے بھی کچھ اصول اور قاعدے بنائے گئے ہیں، اچھے مورخ کو ہمیشہ ان اصولوں اور قاعدوں کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے کہ تاریخ جو بے حد نازک مزاج ہے، خلاف مزاج کوئی بات برداشت نہیں کر سکتی"

تاریخ کے بارے میں یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے اور کہی جاتی ہے کہ "یہ تمام فنی اور سائنسی علوم میں قدیم ترین علم ہے[1] -" اس سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ "زبانی تاریخ (Spoken History) اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ تقریر ، اور تحریری تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ تحریر[2] -" تاریخ عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے لغوی معنی قطعاً وہی ہیں جو انگریزی لفظ ہسٹری (History) ادا کرتا ہے - انگریزی میں لفظ "ہسٹری" لاطینی زبان کے لفظ ہسٹوریا (Historia) سے اخذ کیا گیا ہے جس کے معنی اطلاع ، تحقیق اور معلومات حاصل کرنا وغیرہ ہیں - عام طور پر یہ لفظ دو صورتوں میں استعمال ہوتا ہے - "ایک تو خود حقائق کے ضبطِ تحریر میں لانے اور ان کے بیان کے طور پر اور دوسرے ، حقائق کے مجموعے کی حیثیت سے[3] -" "تاریخ" کا مادہ عربی لفظ ارخ ہے ، جس کے معنی القاموس ، المنجد اور

---

1 - "Of all arts and sciences, history is the oldest."
S. M. Jaffer, History of History P. 2

2. "Spoken History is as old as speech and written word or recorded history is as old as script."
Jaffer, Ibid, P. 2

3 - "As the record of facts and as facts themselves."
Encyclopaedia Britanica (Vol. 11) P. 594

محیط المحیط میں احادیث اور حقائق کا مجموعہ بتائے گئے ہیں۔

اپنی ابتدا سے آج تک تاریخ نے کئی کینچلیاں بدلیں، ارتقا کے سیکڑوں روپ دھارے اور ہزاروں بھیس اختیار کیے ہیں۔ "قصے سے حقیقت، کہانی سے سائنس، حقیقت سے فلسفے اور آرٹ سے وجدان (Intuition) کی حد تک پہنچنے کے لیے اسے ایک طویل سفر طے کرنا پڑا ہے[1]۔" اس طویل سفر کے تجربات نے اسے اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ آج تاریخ ساری دنیا کے علوم کی شہ رگ ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور یہ دعویٰ کرنے میں وہ قطعاً حق بجانب ہے کیونکہ دنیا میں وقوع پذیر ہونے والا ہر واقعہ، اس کا تعلق خواہ کسی سے بھی ہو، در اصل تاریخ ہے۔ اسی بات کو دیکھتے ہوئے ایک صاحب نے کہا ہے: "تاریخ سب کچھ ہے اور سب کچھ تاریخ ہے[2]"۔ دنیا میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات اور تجربات تاریخ کی بدولت ایک زنجیر کی کڑیوں کی صورت میں ایک دوسرے سے منسلک ہیں: وہ ان واقعات کے درمیان ایک رابطے کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اگر ان واقعات اور تجربات کے درمیان یہ رابطہ نہ ہوتا تو شاید آج ہم پچھلی دنیا کے انسانوں سے قطعاً نا واقف اور الگ ہوتے۔ اگر سائنسدان اور مورخ کسی سلسلے کے تجربات کو اکھٹا کر کے آئندہ کے لیے انھیں اپنا رہنما نہ بناتے تو شاید نہیں بلکہ یقیناً پتوں کا لباس، گھاس پھوس

---

1. "From fables to facts, from story to science, from facts to philosophy and from art to intuition it has covered a long distance."

Jaffer, Op. Cit .P. 503.

2. "History is every thing and every thing is history."

Ibid, P. 504

کے گھر اور پتھروں کے بنے ہتھیار آج بھی انسان کی روزمرہ زندگی کا جزو ہوتے۔ یہ تاریخ کا احسان ہے کہ اس نے بیتے ہوئے واقعات اور تجربات کو یک جا محفوظ کر کے نئی شاہراہیں دکھائیں اور دنیا کو اس مقام پر پہنچا دیا جہاں پہنچ کر وہ آج اپنی ترقی یافتہ صورت پر ناز کرتی ہے۔ دنیا، انسان اور تاریخ کے اسی گہرے رشتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شرمن کینٹ (Sherman Kent) نے بڑی دل آویز بات کہی ہے "تاریخ کو ہم اتنا ہی صرف کرتے ہیں جتنا کہ تازہ ہوا کو[1]۔"

تاریخ کی تعریف لوگوں نے مختلف صورتوں میں کی ہے، کارل بیکر (Carl Becker) کے نزدیک یہ تعریف یوں ہے کہ تاریخ "تمام اقوال و اعمال انسانی کا علم"[2] ہے۔ اگر بات کو ذرا پھیلا کر دیکھا جائے تو اتنے کم الفاظ میں تاریخ کی اس سے بہتر تعریف نہیں کی جا سکتی لیکن بعض لوگوں نے تاریخ کی اس تعریف سے اختلاف بھی کیا ہے، اور یہ اختلاف کچھ ایسا غلط بھی نہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ تاریخ دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کے مجموعے کا نام ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ بلا وجہ ہر چیز کا ناطہ تاریخ سے جوڑنا مورخ کے لیے فرض کی حیثیت رکھتا ہے، اسی لیے بعض لوگوں نے تاریخ کی مندرجہ بالا تعریف سے اختلاف کرتے ہوئے اس کے دائرہ عمل

1. "We consume as much history as air."
Sherman Kent, Writing History, P. I
2. "Knowledge of things, said and done". Carl Becker, Every man his own historian. PP 233—255.

کو محدود کرتے ہوئے۔ یوں کہا ہے: "ماضی کی سیاست کا نام تاریخ اور حال کی تاریخ کا نام سیاست ہے[1]۔" اور کسی نے بات ذرا اور آگے بڑھا کر تاریخ کی جزئیات میں سیاست کے علاوہ حکمرانوں کے سوانحی تذکروں اور حالات جنگ کو بھی شامل کر دیا ہے۔ یہ عربی کہاوت اسی طرف دلالت کرتی ہے "تاریخ بادشاہوں اور جنگجوؤں کے لیے، شاعری عورتوں کے لیے اور حساب بنیوں کے لیے ہوتا ہے۔"

تاریخ کی تعریف اور اس کے میدانِ عمل کی وسعت کے سلسلے میں چاہے کتنے ہی اختلاف کیوں نہ ہوں اس امر سے بہر طور کسی کو انکار کی مجال نہ ہوگی کہ دنیا کے تمام علوم میں تاریخ اپنا ایک ممتاز، اور خاص مقام رکھتی ہے لیکن یہ مقام اسے یونہی بیٹھے بٹھائے نہیں مل گیا۔ اس کے لیے اسے بڑے جتن کرنا پڑے ہیں۔ اپنے محسنوں سے اس کے چند تقاضے رہے ہیں جنھیں پورا کیے بغیر تاریخ کو یقیناً یہ وقعت حاصل نہ ہوسکتی تھی۔ تاریخ بڑی نازک شے ہے، وہ اپنے مزاج کے خلاف نہ تو کوئی بات برداشت کرتی ہے اور نہ کسی خلافِ مزاج شے کو قریب پھٹکنے دیتی ہے۔ اس کی اسی نزاکتِ مزاج کے ہاتھوں مجبور ہوکر مورخوں نے تاریخ نویسی کے لیے چند اصول اور قاعدے ترتیب دے رکھے ہیں۔ یہ اصول اور قاعدے مورخ کے لیے پاؤں کی زنجیر کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس زنجیر سے مورخ کی آزادی، تاریخ کو قطعاً گوارا نہیں۔

---

1. "History is past politics and past politics is present history."

Seeley, quoted in Contemporary History P. 20

تاریخ نویسی کے لیے جو چیزیں جزوِ ایمان کی حیثیت رکھتی ہیں ان میں سب سے پہلی چیز سادگیٔ بیان ہے ۔ تاریخ اور انشا پردازی کا آپس میں کوئی تعلق نہیں بلکہ دیکھا جائے تو اِن کی حیثیت مخالفین کی سی ہے ، نہ تاریخ کو انشا پردازی کا ساتھ گوارا ہے اور نہ انشا پردازی تاریخ کا ساتھ دے سکتی ہے کیونکہ اگر مورخ لکھتے لکھتے انشا پردازی شروع کر دے تو بلاشبہ وہ اپنے مقاصد اور فرائض قربان کر کے صرف انشا کا ہو رہے گا ، اُسے تاریخی واقعات کی صحت سے زیادہ اپنی زبان، طرزِ تحریر اور جملوں کی نوک پلک سنوارنے کی فکر ہوگی ۔ یوں تاریخ حقیقی دنیا سے ہٹ کر افسانوی اور داستانوی دنیا کے زیادہ قریب آ جائے گی ۔ بایں ہمہ مورخ اور زبان و بیان کا آپس میں بڑا گہرا اور بڑا قریبی تعلق بھی ہے، وہ یوں کہ اگر مورخ زبان و بیان سے بے اعتنائی برتتے ہوئے مبہم اور غیر واضح باتیں لکھنا شروع کر دے تو بھی اُس کا مقصد اور فرض پورا نہیں ہو سکتا کہ اگر بات کسی کی سمجھ ہی میں نہ آئے گی تو وہ اس سے فائدہ کیا اُٹھائے گا ۔ شرمن کینٹ (Sherman Kent) نے اسی بات کو دیکھتے ہوئے کہا ہے : ''مورخ کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ وہ جو کچھ بھی کہے، بڑی صاف اور سمجھ میں آنے والی زبان میں کہے [1]۔'' اسی بات کو شرمن کینٹ (Sherman Kent) نے ان الفاظ میں بھی ادا کیا ہے : ''تاریخ کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ وہ واضح طور پر بیان کیے ہوئے واقعات کی

1. "He must realize that a thought expressed must be expressed in an understandable idiom."

Kent, Op, Cit , P. 42

ایک مسلسل رو ہو'۔"

تاریخ نویسی کا فن مورخ کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ غیر ضروری باتوں اور فروعات میں پڑ کر اپنے مرکز خیال کو چھوڑ دے۔ نہ آسے زبان و بیان کے بکھیڑوں میں پڑنے کی اجازت ہوتی ہے اور نہ پہیلیاں بجھوانے کی بلکہ آس کا فرض محض یہ ہوتا ہے کہ وہ سیدھی سادی زبان میں ہر واقعے کو بلا کم و کاست اس کی اصل شکل میں بیان کر دے۔ اس سلسلے میں ایکٹن (Acton) نے کچھ اس طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے کہ "تاریخ نویسی کی مقتضیات مورخ کو صاحبِ قلم کے بجائے مدیر انسائیکلوپیڈیا بنا دیتی ہیں[۲]۔"

مورخ کے لیے ضروری ہے کہ وہ جو واقعہ بھی بیان کر رہا ہو آس کے اچھے اور برے دونوں پہلو قاری کے سامنے رکھ دے، کیونکہ جس طرح ایک منصف پچھلے مقدمات کے فیصلوں کی روشنی میں آگے چل کر آسی قسم کے مقدمات کا فیصلہ کرتا ہے اور جس طرح ایک معالج کسی مرض کی تشخیص کے لیے مریض کی روداد مرض (Case history) جاننا ضروری سمجھتا ہے آسی طرح دنیا میں مختلف النوع واقعات سے سرخرو ہونے کے لیے آدمی کو تاریخ کا سہارا لینا پڑتا ہے کیونکہ مستقبل کا حال جاننے والا اللہ تعالیٰ

1. "Historiography must have as its prime characteristic a continuous flow of clearly stated ideas."

Kent, Op., Cit., P. 43

ایکٹن کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

2. "Requirements pressing on the historian, threatening to turn him from a man of letters into the compiler of an encyclopaedia" Acton, Cambridge Modern History I.P.4.

کے علاوہ کوئی نہیں ، انسان محض ماضی سے آشنا ہے ، وہ برابر اس جستجو میں رہتا ہے کہ کسی طرح اپنے مستقبل کو درخشاں دیکھے ۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ اپنے دیکھے بھالے ماضی کو اپنا رہنما بنائے، ظاہر ہے اس صورت میں وہ تاریخ کی مدد کے بغیر یہ کام انجام نہیں دے سکتا بقول بیہقی "خرد مند مورخ ایسا مزاج شناسِ زمانہ ہوتا ہے کہ آئندہ زمانے کے نیک و بد پر حکم لگا سکتا ہے[1] ۔"

مورخ کی حیثیت ایک رہنما کی سی ہوتی ہے ، قاری اس سے محض قصے سننے کا خواہش مند نہیں ہوتا بلکہ اس کی رہنمائی میں منزلِ مقصود کی طرف قدم بڑھانے کا خواہاں ہوتا ہے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ مورخ کو صرف واقعہ نگار نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے یہ بھی سمجھاتے جانا چاہیے کہ ماضی میں کوئی خاص کام کرنے سے بھلا برا کیا نتیجہ نکلا اور آئندہ اسی نوعیت کے معاملات میں کیا اقدام کرنا چاہیے کہ "تاریخ کا مقصد حال کی تفسیر اور مستقبل کی تعمیر کے حوالے سے ماضی کی بازیافت ہے[2] ۔"

یہ سب کچھ اسی صورت میں ممکن ہے کہ مورخ قصہ گوئی اور داستان طرازی کرنے کے بجائے صرف حق گوئی کو اپنا مسلک بنائے اور جو کچھ دیکھے اور جس طرح دیکھے اسے اسی طرح بیان کر دے ۔ ظاہر ہے اگر مورخ جانبدار ہوگا تو وہ اپنی پسند کی باتوں اور کرداروں کی خامیاں چھپا کر صرف اچھائیاں بتائے گا اور اپنے مخالفوں کے

---

۱ ۔ منقول از تاریخ ہندوستان جلد اول صفحہ ۵

1. "The aim of history is to explore the past with a view to explaining the present and improving the future."
Jaffer, Op. Cit p. 123

یہاں اُسے برائیوں کے علاوہ کچھ نہ ملے گا ۔ اس صورت میں یقیناً اُس کی دکھائی ہوئی راہ مستقبل سنوارنے والوں کو منزلِ مقصود تک نہ پہنچا سکے گی ، اس بات کو دیکھتے ہوئے شرمن کینٹ (Sherman Kent) نے کہا ہے : "تاریخ کی صحیح ، مناسب ، سچی اور قطعی پیش کش کا راز غیر جانبداری میں نہیں بلکہ بے تعصبی میں مضمر ہے[1] ۔"

مورخ کی کوئی ایک حیثیت نہیں ہوتی ، اُسے تاریخ نویسی کے خار زار سے سلامت روی کے ساتھ گزرنے کے لیے کئی بھیس بدلنے اور کئی روپ دھارنے پڑتے ہیں ۔ اُس کی سوچ کا تعلق صرف اپنے زمانے اور اپنے ماحول سے نہیں ہوتا بلکہ اُسے ہر اُس زمانے اور اُس ماحول کا فرد بننا پڑتا ہے جس کی وہ تاریخ لکھ رہا ہو ۔ یہ شرط صرف ماحول اور زمانے ہی کے معاملے میں لاگو نہیں ہوتی بلکہ ایک اچھے مورخ کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ جس ملک کی تاریخ لکھ رہا ہو اُسی کے حسبِ حال اپنے آپ کو ڈھال لے مثلاً اگر ہم چند صدی پہلے کے واقعات کا جائزہ لینے بیٹھیں اور کسوٹی بنائیں آج کے ماحول اور زمانے کو تو یقیناً یہ واقعات ہمیں دقیانوسیت کے علاوہ کچھ معلوم نہ دیں گے ۔

اسی طرح اگر ہم بات کہہ رہے ہوں مغربی تہذیب و تمدن کی یا کسی مغربی ملک کی اور اُس کا جائزہ اپنے ماحول کو سامنے رکھ کر لیں تو یقیناً یہ انصاف نہ ہوگا بلکہ اس سے کئی قسم کی غلط فہمیاں پیدا ہو جائیں گی مثال کے طور پر آج سے

1. "Impartiality, not neutrality is the key to the correct, proper and just presentation of history."

Kent, Op. Cit., p. 11

کوئی دو تین صدی پہلے کے ہندوستان کی تاریخ ذہن میں لائیے ، یہاں ہمیشہ سے یہ اصول چلا آ رہا تھا کہ ملک کی رعایا ہر معاملے میں بادشاہ کے سامنے جوابدہ تھی اور بادشاہ کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون تھا ، اس صورت حال کو سامنے رکھ کر اگر کوئی برطانوی نظامِ حکومت کا حامی مورخ ، ہندوستان کی تاریخ لکھے تو ظاہر ہے اس کے لیے یہاں کے حکمرانوں کو مطلق العنان اور ڈکٹیٹر قرار دینے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ ہو گا ۔ دوسری طرف انگلستان کی تاریخ لکھنے کی ذمہ داری اگر کسی ہندوستانی ذہن کے مورخ کو سونپ دی جائے تو وہ شہنشاہِ انگلستان اور شاہِ شطرنج میں کوئی فرق نہ کر پائے گا ۔

اس مثال کو دیکھتے ہوئے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا کہ صحیح تاریخ لکھی ہی اُس وقت جا سکتی ہے جب کہ مورخ اپنے آپ کو خود اُس زمانے اور ماحول کا فرد بنا لے جس کی وہ تاریخ لکھ رہا ہو ۔

تاریخ لکھنے کے لیے مورخوں نے بڑے متنوع اور باہم متخالف اصول ترتیب دیے ہیں۔ بعض نے غلط طور پر تاریخ کو محض حاکم ، اکابر مملکت ، بزرگان دین اور واقعات جنگ کے ذکر تک محدود قرار دیا ہے ، اُن کے نزدیک تاریخ صرف انہی لوگوں اور واقعات کے گرد گھومتی ہے ۔ ذکااللہ جیسے مورخ نے تاریخ کی عظمت اور بڑائی ہی اس میں دیکھی ہے کہ وہ کم رتبہ لوگوں کے ذکر کو پاس نہیں پھٹکنے دیتی ، اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں : ”انبیا و خلفاء، سلاطین و بزرگانِ دین و وقت کے آثار و اخبار جاننے کا نام علمِ تاریخ ہے ۔ علمِ تاریخ سے شغل رکھنا بھی انہیں کے ساتھ مخصوص ہے ، جو دین و دولت کی بزرگی

اور کمالات میں مشہور ہوں - کمینے، پاجیوں اور ذلیل بازاریوں کو علمِ تاریخ سے کچھ مناسبت نہیں ہے اور نہ ان کا یہ پیشہ و حرفہ ہے - ان کو علمِ تاریخ سے نہ کچھ منفعت ہوتی ہے اور نہ کبھی وہ اُن کے کام آتی ہے - وجہ اس کی یہ ہے کہ علمِ تاریخ میں تو دین و دولت کے بزرگوں کے اوصاف کے اخبار اور محامد و مناقب و مآثر بیان ہوتے ہیں - ارازل، مفلسوں و کم اصلوں کو اس کی طرف میل و رغبت نہیں ہوتی[۱] -"

یہ جانتے ہوئے کہ تاریخ کسی خاص حد، زمانے، وقت یا ماحول کی پابند نہیں، ذکا اللہ کا مندرجہ بالا بیان ماننے کو جی نہیں چاہتا کیونکہ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے تاریخ تو دنیا میں پیش آنے والے واقعات کے مجموعے کو کہا جاتا ہے - اب یہ کیا ضروری ہے کہ دنیا میں ظہور پذیر ہونے والے ہر واقعے کا تعلق کسی بڑے آدمی ہی سے ہو - اگر ذکا اللہ کی اس رائے کو صحیح مان لیا جائے تو تاریخ لکھنے والے کے لیے کئی دشواریاں پیدا ہوجاتی ہیں، اُسے کئی تاریخی حقائق سے چشم پوشی کرنا پڑتی ہے اور کئی ایسی شخصیتوں کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے جن کا "کم اصل" ہونے کے باوجود تاریخ سے بڑا گہرا تعلق تھا - اس سلسلے کی مثالیں اگر صرف ہندوستان کی تاریخ سے لی جائیں تو سب سے پہلے تو یہ بات طے ہے کہ خاندان غلاماں کے حکمران تاریخ نویسی کی اس کسوٹی پر پورے نہیں اترتے اس لیے ہندوستان کی تاریخ لکھنے والے کو اُن کے عہدِ حکومت کے ذکر کا کوئی حق نہیں پہنچتا - اسی طرح آگے چل کر شیر شاہ سوری کا نام ہندوستان کی تاریخ کے اوراق میں لکھے جانے کا حقدار نہیں کہ

---

۱ - تاریخ ہندوستان جلد اول صفحہ ٦

شیر شاہ سوری بھی بچپن میں نمک بیچا کرتا تھا اور اسی فیصلے کا اطلاق نظام سقہ جیسے لوگوں پر بھی ہونا چاہیے - ظاہر ہے ان تاریخی شخصیتوں کو نظر انداز کرنے کے ساتھ ساتھ مورخ کو اُن سے وابستہ تاریخی حقائق کو بھی بھولنا ہو گا - فنی اعتبار سے یقیناً یہ بات قابلِ قبول نہیں کہی جا سکتی لیکن مورخ پر رطب و یا بس کے برتنے کی ایسی سخت پابندی یا مجبوری ہرگز نہیں بلکہ جیسا کہ لٹن اسٹریچی (Lytton Strachey) نے کہا ہے : "لاتعلقی مورخ کا اولین وصف ہے - ایسی لاتعلقی، ترک و اختیار جس کا مسلکِ خاص ہے[۱] -"

لیکن چیزوں اور واقعات کے نظر انداز کرنے کا یہ معاملہ مورخ کی ذاتی پسند سے تعلق نہیں رکھتا کیونکہ تاریخ نویسی کے لیے "صحت (Accuracy) فریضے کی حیثیت رکھتی ہے، پسند کی نہیں[۲] -" البتہ اپنی رائے کے معاملے میں مورخ کسی حد تک آزاد ضرور ہوتا ہے لیکن یہاں بھی اُس پر یہ پابندی عائد ہے کہ وہ آزادیٔ رائے کا اظہار تو کر سکتا ہے لیکن حقائق کو توڑ مروڑ کر اپنی مرضی کے مطابق نہیں ڈھال سکتا کیونکہ سی - پی - اسکاٹ (C.P. Scott) کے بقول مورخ کے لیے "آزادیٔ رائے کے باوجود حقائق مقدس ہوتے ہیں[۳] -" لیکن اس آزادیٔ رائے

1. "Ignorance is the first requisite of the historian, ignorance which selects and omits." Lytton Strachey, Eminent Victorians, P. 7
2. "Accuarcy is a duty not a virtue." M.Marvilli Astromomicon : Libur Primus P. 87.
3. "Facts are sacred, opinion is free" C. P. Scott, quoted in "What is History" by E.H. Carr P. 10.

کا مطلب بے لگام آزادی یا یہ ہرگز نہیں کہ مورخ کسی بات کا پابند ہوئے بغیر جو جی میں آئے لکھ جائے بلکہ اس کے لیے اسے کئی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جیسا کہ رینکے (Ranke) نے کہا ہے : "مورخ کا کام محض یہ ہے کہ وہ جس طرح جس چیز کو دیکھے اسی طرح بیان کر دے[1] ۔" البتہ یہ ضرور ہے کہ مورخ کو کبھی کبھی ان جکڑ بندیوں سے نکل کر اپنے ذاتی مشاہدات کی روشنی میں بھی حالات کا جائزہ لینا چاہیے ۔ شرمن کینٹ (Sherman Kent) نے اس سلسلے میں مورخ کو مشورہ دیا ہے کہ "اسے چاہیے کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے ذہن کو مواد کی پابندیوں سے آزاد کرکے اس کا موقع دے کہ وہ غیر جواز یافتہ نظریات کی اقلیم میں سفر کرے اور اپنے ان ذاتی تجربات پر بھروسہ کرے جن کا مسئلہ زیر بحث سے کوئی تعلق نہیں[2] ۔"

لیکن جب یہ کہا جاتا ہے کہ تاریخ کو صرف سلاطین اور اکابر مملکت کے ذکر تک محدود نہیں رہنا چاہیے تو اس سے یہ مراد ہرگز نہیں ہوتی کہ تاریخ لکھتے وقت غیر ضروری جزئیات اور معمولی سے معمولی باتوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ واقعے کی اہمیت اور ضرورت کے اعتبار سے کہیں کہیں تو جزئیات کا بیان ضروری ہوتا ہے لیکن ہر جگہ جزوی تفاصیل

1. "The task of the historian is simply to show how it really was" Ranke, quoted in History of History p.8.

2. "From time to time release your mind from the restrictions of the material and give it a chance to operate in the realm of unvalidated theory. Draw upon personal experience which has no bearing upon the problem at hand." Kent, Op. Cit., p. 48.

ضروری نہیں ہوتیں - تاریخ اپنے پڑھنے والوں کے لیے استاد کی ذات کا منصب رکھتی ہے ، جو مصائب اور مشکلات سے بچنے یا نبٹنے میں ان کی رہنمائی کرتی ہے ، بھول بھلیوں میں نہیں لے جاتی - اس لیے ظاہر ہے کہ یہ غیر ضروری تفاصیل کی متحمل نہیں ہو سکتی کہ چھوٹی چھوٹی تفصیلات مسائل حل کرنے کے بجائے پڑھنے والے کے لیے کئی نئے مسئلے کھڑے کر دیتی ہیں اور دوسرے یہ کہ ان کی وجہ سے تحریر میں بلاوجہ کی طوالت جانے کے ساتھ ساتھ پہیلیاں اور بھول بھلیاں پیدا ہو جاتی ہیں - یہ دونوں چیزیں تاریخ کے لیے سم قاتل کی حیثیت رکھتی ہیں -

بعض مورخوں نے تاریخ اور مذہب میں بڑا گہرا اور بڑا قریبی تعلق بتایا ہے ، بقول ایس ایم جعفر ''تاریخ اور مذہب میں نہایت قریبی تعلق ہے - دونوں ایک دوسرے کے قریبی عزیز ، ممد و معاون اور لازم و ملزوم ہیں - دونوں کا مطمح نظر اور بنیاد سچائی ہے - اگر ان دونوں کی صحیح طور پر پیروی کی جائے تو یہ دونوں انسانیت کے ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں - مذہب تاریخ کی راہ دکھاتا ہے اور تاریخ مذہب کی جانب رہنمائی کرتی ہے- سچائی ، انصاف اور ایمانداری کا نام مذہب ہے اور یہی تاریخ کی بنیاد ہیں[1] -''

---

1. "There is a close connection between History and Relegion. The two are interrelated and interdependent. The influence of one over the other is as evident as it is inevitable. Both of them aim at truth......Both of them can save and help humanity if rightly followed. Relegion leads to History and History leads to Relegion. The former provides the principles of truth, justice and horesty which form the foundations of history." Jaffer, Op. Cit., p. 7.

اس بیان میں ایس - ایم - جعفر نے مذہب اور تاریخ کے جس باہمی رشتے کی طرف اشارہ کیا ہے ، وہ بڑی حد تک صحیح ہے لیکن اس تقابل میں ایک لحاظ سے منطقی اختلاف کی گنجائش موجود ہے اس لیے کہ اس بیان میں تاریخ اور مذہب میں جو رشتے قائم کیے گئے ہیں وہی ان دونوں کی انتہا و انجام نہیں بلکہ ان باہمی مقتضیات کے علاوہ ان دونوں کے کچھ اور تقاضے بھی ہیں جنھیں پورا کیے بغیر ان کا وجود ہی ناممکن ہے - اگر ان تقاضوں پر نظر رکھی جائے تو کبھی کبھی مذہب اور تاریخ میں باہم بڑا طویل فاصلہ پیدا ہو جاتا ہے ، معلوم ہوتا ہے کہ اس کا احساس خود ایس - ایم - جعفر کو بھی ہے اسی لیے انھوں نے مذہب اور تاریخ کی اس قربت اور یگانگت کو دیکھنے کے باوجود خود اعتراف کیا ہے کہ ''مذہب اور تاریخ کا خمیر ایک ہی عناصر سے اٹھا ہے لیکن اس کے باوجود وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ دے کر نہیں چل سکتے[1] -"

تاریخ کا اہم ترین تقاضا غیر جانبداری ہے - ایک جانبدار شخص کی لکھی ہوئی تاریخ کو تاریخ کہنا ہی بجائے خود تاریخ کے ساتھ زیادتی ہے - ایک طرف تو تاریخ نویسی کے لیے غیر جانبداری کی ایسی کڑی شرط ہے اور دوسری طرف مذہب کی مقتضیات میں یہ بات شامل ہے کہ اسے کچھ نہ کہا جائے - مذہب کو مقدس جان کر تاریخ لکھنے والا اس کی تقدیس اور تقدیم کے پیش نظر کبھی بھی مذہب کے خلاف کچھ نہیں لکھ سکتا اس لیے کہ وہ مذہب کے معاملے میں ہر دوسری چیز کے

---

1. "Relegion and history are composed of the same elements but they can't walk hand in hand."
Jaffer, Op. Cit , P. 7

مقابلے میں جذباتی ہوتا ہے اور جذبات کی یہ عینک آنکھوں پر چڑھا کر تاریخ لکھنے والے کو دوسرے مذاہب میں برائیاں ہی برائیاں نظر آتی ہیں ، اُس کی نظر صرف اُن کی برائیوں پر جاتی ہے اور وہ اپنی جذباتیت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کئی حقائق کو نظر انداز کر جاتا ہے اور یوں تاریخ کے ایک اور اہم تقاضے سچائی کو بھی ٹھیس پہنچانے کا باعث بنتا ہے ۔

ناول ، افسانہ ، ڈرامہ ، داستان ، قصہ اور اسی قبیل کی دوسری چیزیں لکھتے وقت مصنف کے ذہن میں پہلے سے اپنی تصنیف کا خاکہ یا پلاٹ موجود رہتا ہے جسے وہ اپنی تصنیف کو دلچسپ بنانے کے لیے حقائق میں تخیل کے پیوند لگا کر مرتب کرتا ہے ۔ اُسے اپنے ذہن میں یہ بات پہلے سے طے کرنا پڑتی ہے کہ کسی خاص کردار یا واقعے کو اُسے اپنی کہانی میں کیا مقام دینا ہے یا کس طرح پیش کرنا ہے ۔ لیکن ایک مورخ کو تاریخ لکھتے وقت اپنا ذہن بالکل صاف رکھنا ہوتا ہے اُسے کسی خاص واقعے یا کردار کو کسی مخصوص رنگ میں ڈھالنے یا پیش کرنے کی اجازت نہیں ہوتی بلکہ وہ مجبور ہوتا ہے کہ جس رنگ میں بھی واقعات اور حقائق اُس کی نظر سے گزریں اُنھیں اُسی طرح من و عن پیش کر دے ۔

تاریخ کی جو مختلف النوع تعریفیں کی گئی ہیں اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ تاریخ جذبۂ حب الوطنی پیدا کرنے کی مشین ہوتی ہے ۔ اس تعریف سے کسی صورت بھی اتفاق نہیں کیا جا سکتا کیونکہ تاریخ کو اگر جذبۂ حب الوطنی پیدا کرنے کا آلہ بنا لیا جائے تو اس کے لیے مورخ کو کئی ایسی شرائط پوری کرنا پڑتی ہیں جو تاریخ کے فنی تقاضوں سے قطعاً ہم آہنگ نہیں ۔ مثال کے طور پر اگر تاریخ سے یہ خدمت لی جانے لگے تو

اس کے لیے مورخ کو سب سے پہلے تو اپنی تحریر میں کچھ کچھ شعریت اور ڈراماٸی کیفیت پیدا کرنا ہو گی اور دوسرے یہ کہ اسے کوشش کرنا ہو گی بلکہ وہ اس بات پر مجبور ہوگا کہ اپنی لکھی ہوئی تاریخ میں اپنے دشمنوں کے لیے ایک بھی تعریفی کلمہ نہ لکھے۔ یہ دونوں ہی باتیں تاریخ نویسی کی فنی ضروریات کے قطعی خلاف اور تاریخ کے وجود کے لیے مہلک ہیں ۔ اس کے علاوہ اس صورت میں مورخ کے لیے یہ بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی بات منوانے کے لیے ایک ہی بات کو کئی کئی مرتبہ دھراتا رہے ۔ یہ بات کسی اور معاملے میں تو شاید صحیح ہو تاریخ کے معاملے میں در خور اعتنا نہیں سمجھی جا سکتی ۔ ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے صاف صاف لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ حب الوطنی پیدا کرنے کی مشین ہرگز نہیں ہے ۔ اسی بات کے معنی یوں بھی نکالے جاسکتے ہیں کہ تاریخ میں کسی قسم کی مقصدیت نہیں آنی چاہیے کہ یہ تاریخ کے کئی اور اہم تقاضوں کی قربانی کا باعث بنتی ہے ۔

مورخ کے لیے جیسا کہ شرمن کینٹ (Sherman Kent) نے لکھا ہے ” اولین اور سب سے اہم قاعدہ یہ ہے کہ وہ جو کچھ بھی لکھے وہ اس کی نظر میں واضح ہو[1]۔“ اسی بات کو شبلی نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے : ”مورخ اگر جنگ کا حال لکھے تو اسے اس کی جزوی تفاصیل حتیٰ کہ آلات جنگ تک کا ماہر ہونا چاہیے[2]۔“ لیکن یہ انتہا مبالغے کے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں کی جزوی تفاصیل تو ایک طرف ، آن کے

1. "The first and most important rule is to be sure you know, what you want to say." Kent, Op. Cit., p. 44

۲ ۔ الفاروق صفحہ ۱۱

بارے میں موٹی موٹی باتیں جاننا بھی مشکل ہوتا ہے ۔ ظاہر ہے مورخ ہر شے کا ماہر تو ہو نہیں سکتا ، یہ ضرور ہے کہ اگر وہ آلاتِ جنگ کا ذکر کر رہا ہو تو اُسے کم از کم اُن کی نوعیت اور ہئیت ضرور جاننی چاہیے ، یہ نہیں کہ وہ برچھی کو کوئی گولی چلانے والا آلہ اور بندوق کو تیز دھار چھرا سمجھے۔ یہ مسائل اور مراحل ، مہارت نہیں ، عام اور سرسری واقفیت سے بھی طے ہو سکتے ہیں ۔

معیاری تاریخ لکھنے کے لیے مورخ کو جو جتن کرنا پڑتے ہیں اُن میں سب سے اہم تحقیق و تدقیق ہے ۔ جس کی نسبت سے بعض لوگوں نے مورخ کو ”گورکن“ اور تاریخ کو ”گڑے مردے اکھاڑنے کا دوسرا نام“ قرار دیا ہے ۔ اور یہ بہت کچھ صحیح بھی ہے اس لیے کہ تاریخ ، اندازوں کا کھیل نہیں کہ قیاسات کی رہنمائی میں ، منزل دیکھے بھالے بغیر قدم بڑھائے جائیں اور منزل ہاتھ آ جائے ، بلکہ یہ ایک ایسی اندھیری راہ ہے جس پر کوشش و جستجو کے بغیر چلنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا ہے اور اگر مورخ بے احتیاطی سے قدم بڑھائے تو ناکامی اور تاریخ کے دشمن اُس کا استقبال کرنے کے لیے ہر دم تیار رہتے ہیں اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جس شخص میں تحقیق و تدقیق کا مادہ نہ ہو وہ بڑا مورخ نہیں بن سکتا ۔

جیسا کہ پہلے بھی بیان ہوا ہے ، تاریخ انسان کے رہنما کی حیثیت رکھتی ہے، وہ ہمیں بتاتی ہے کہ کسی خاص مسئلے یا مشکل کا حل ہمارے آباء و اجداد نے کس صورت میں نکالا تھا یا کسی مخصوص حکمتِ عملی کے اپنانے سے کسی خاص حکمران کو کن نتائج کا سامنا کرنا پڑا ۔

ان سب باتوں کا صحیح حل نکالنا تحقیق و تدقیق کے

بغیر ممکن نہیں ہوتا کیونکہ ضروری نہیں کہ جدا جدا انداز فکر و نظر کے حامی مورخ ہر واقعے کو ایک ہی طرح جانچتے ہوں بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے کہ اگر ایک مورخ کسی خاص واقعے کے متعلق ایک رائے قائم کرتا ہے تو دوسرا مورخ اسی واقعے کو کسی اور طرح دیکھتا ہے ، یوں ایک ہی بات دو طرح سے بیان ہو جاتی ہے - اس صورت میں آنے والے مورخوں کا کام خاصا دشوار ہو جاتا ہے - اُن کے پاس اس دشواری سے عہدہ برآ ہونے ، اس کا درست حل ڈھونڈنے اور اندھیرے میں صحیح راہ تلاش کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہوتا ہے ــــ تحقیق - قیاسات اور اندازے اس مشکل میں ساتھ نہیں دیتے کہ قیاسات اور اندازوں سے اُسی مسئلے کا کوئی ایسا حل بھی نکل سکتا ہے جو حقیقت سے بہت دور ہو ، یوں تاریخ کی رہنمائی میں چلنے والوں کے لیے بھٹکنے کی بڑی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے ، ظاہر ہے یہ بات تاریخ کے بنیادی مقاصد اور فرائض کے قطعی خلاف ہے -

ان باتوں کو دیکھتے ہوئے تحقیق و تدقیق کی اہمیت اور تاریخ اور اس کی قربت کا احساس اور شدت سے ہوتا ہے - چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر تاریخ ، مسائل حل کرنے میں انسان کی رہنمائی کرتی ہے تو خود تاریخ ان مسائل کے حل کے لیے تحقیق و تدقیق کی محتاج ہوتی ہے اور یہی بات تحقیق و تدقیق کے تاریخ سے رشتے کی نزاکت اور خود تحقیق و تدقیق کی اہمیت کے اندازے کے لیے کافی ہے -

دوسری پابندیاں پوری کرنے کے علاوہ مورخ کے لیے یہ

بھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ موضوع سے ہٹ کر اِدھر اُدھر
کی باتوں میں پڑنے کے بجائے صرف اپنے کام سے کام رکھے کہ
"صحیح تاریخ نویسی کے لیے موضوع سے ہٹ کر کچھ کہنا
پیغام اجل کی حیثیت رکھتا ہے[1]۔"

1. "Irrelevancy is a death blow for the correct sort of historiography." Kent, Op, Cit., p. 67

شبلی بحیثیت مورخ

حصہ اول

"شبلی کی تاریخ نویسی کے فن کا جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ کیا تصانیف کی ضخامت، کیا کیفیت، کسی بھی اعتبار سے اُن کا مرتبہ کم نہیں، وہ بلا شبہ ایک بڑے مورخ تھے اور ایک ایسے بڑے مورخ جنھوں نے کبھی بھی فنی ضروریات اور مقتضیات کو نظر انداز نہیں کیا۔"

ہندوستان میں مسلمانوں کے عروج کا آفتاب غروب ہو رہا تھا کہ ۱۸۵۷ع میں اعظم گڑھ کی بستی نے شبلی کو جنم دیا ۔ شبلی کے ایک کان نے اذان کی آواز سنی تو دوسرے میں جنگِ آزادی کے ہنگاموں کا شور سنائی دیا ۔ جنگ آزادی کا شعلہ بھڑکا اور فضا میں ہر طرف دھواں بکھیر اور پھیلا کر خاموش ہو گیا ۔ دھوئیں کے ان بادلوں میں مسلمان اپنی منزلِ مقصود کی جستجو میں بھٹکتا رہا ۔ اس کے کرب و اضطراب اور اس پر انگریزوں کے ہاتھوں ڈھائے جانے والے مظالم کی داستان بچے بچے کی زبان پر تھی ۔

ان حالات میں پلنے بڑھنے والا بچہ ہوش سنبھالتے ہی انگریزوں کے خلاف برسرِ پیکار ہو سکتا تھا، لیکن ایسا نہ ہوا ۔ پڑھا لکھا گھرانا تھا ۔ خاندانی روایات کے مطابق شبلی کو بھی پڑھنے بٹھا دیا گیا ۔ اور ان کی تعلیم و تربیت اسی انداز سے شروع ہوئی جو اس زمانے کا دستور تھا ۔ مولوی عبداللہ جیراجپوری نے ابتدائی تعلیم دی ، ابتدائی تعلیم ختم ہونے پر ان کے لیے ایسے استاد کی ضرورت محسوس ہوئی جو انہیں مروجہ علوم اور خاص طور پر عربی کی تعلیم دے سکتا ۔ چنانچہ شبلی کے والد نے انہیں اپنے وقت کے مشہور عالم محمد فاروق صاحب چڑیا کوٹی کے سپرد کر دیا ۔ ایک تو استاد صاحبِ کمال تھے

دوسرے شبلی خود بھی ذہین اور علم کے شائق تھے ۔ انھوں نے "صرف سترہ برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے ظاہری علوم کی تکمیل کر لی' ۔" استاد شاگرد کی محبت اس درجہ بڑھی کہ مولانا فاروق ، شبلی کو مخاطب کر کے فخر سے کہا کرتے تھے "انا اسد و انت شبلی" یعنی میں شیر ہوں اور تو شیر کا بچہ ۔۔ مولانا فاروق سے تعلیم پانے کے بعد شبلی دوسرے شہروں میں اہلِ علم کی صحبت سے فیض یاب ہوئے ۔

۱۸۷۵ع میں مولانا فیض الحسن کے پاس جو اورینٹل کالج میں عربی ادبیات کے پروفیسر تھے لاہور پہنچے ۔ یہاں پہنچ کر مسئلہ یہ کھڑا ہوگیا کہ وہ کالج کے پابند نہ ہونا چاہتے تھے اور مولانا کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ انھیں علیحدہ درس دیتے ، لیکن شبلی کی طلب علم نے مولانا فیض الحسن سے فیض اٹھانے کا ایک حل نکال لیا ۔ طے یہ ہوا کہ ''وہ روز گھر سے کالج اور کالج سے گھر آتے جاتے مولانا کے ساتھ ہولیتے اور باتوں ہی باتوں میں ان مسائل کو پوچھ لیتے جن سے مولانا سے استفادہ منظور تھا' ۔" یوں علم کے پیاسے کو قطرہ قطرہ پانی ملتا رہا ۔ علماء کے فیض سے شبلی خالص مذہبی رنگ میں رنگ گئے ۔ علی گڑھ پہنچنے سے قبل یہ رنگ ان پر پوری طرح چڑھ چکا تھا ۔ مذہبی تعلیم ہی کا اثر تھا کہ انھوں نے ''ظل الغمام فی مسئلۃ القراۃ خلف الامام" اور ''اسکات المعتدی" جیسی کتابیں لکھ کر اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز کیا، لیکن قدرت شبلی سے یہ نہیں کچھ اور کام لینا چاہتی تھی ، ان کی منزل یہاں نہیں کہیں

---

۱ - زینت ساجدہ، حیات شبلی، شبلی نمبر، صبا حیدرآباد صفحہ ۱۳

اور تھی -

۱۸۸۲ء میں وہ اپنے والد کے ہمراہ پچیس برس کی عمر میں علی گڑھ پہنچے - لیاقت خود لیاقت شناس کے دروازے پر کھڑی تھی ، پہلی ہی ملاقات میں سرسید کو اُن کی صلاحیتوں کا اندازہ ہوگیا ، انھیں شبلی میں وہ جوہر نظر آئے جن کی تلاش انھیں ایک مدت سے تھی لیکن اُس وقت وہ شبلی کے لیے کچھ نہ کر سکے البتہ اگلے برس کالج میں عربی کے استاد کی ضرورت محسوس ہوئی تو شبلی کا اس کام کے لیے چناؤ ہوگیا - سرسید اور شبلی کے تعلقات اس دوران میں اس حد تک بڑھے کہ سرسید نے شبلی کو اپنی کوٹھی ہی میں رہنے کی جگہ دے دی اور اپنا کتب خانہ مطالعہ کے لیے ان کے حوالے کردیا ، شبلی کتب خانے میں بیٹھے گھنٹوں مطالعہ کیا کرتے ، کبھی الماریوں کے سامنے ہی کھڑے کھڑے کتابوں کی ورق گردانی کرتے - تھک جاتے تو وہیں الماری کے سامنے اکڑوں بیٹھ کر مطالعہ جاری رکھتے پھر کھانے کی میز پر سرسید کا ساتھ ہوتا تو دونوں میں نئے نئے مسائل پر گفتگو چھڑتی یوں دونوں کو ایک دوسرے کے خیالات جاننے کا موقع ملتا[۱] -"

سرسید کی شخصیت میں اتنی کشش تھی کہ ان کے ساتھ کا ہر کام کرنے والا ان کی شخصیت میں جذب ہو کر رہ جاتا تھا لیکن شبلی کے ساتھ ایسا نہ ہوا - انھوں نے سرسید کی صحبت سے فائدہ بھی اٹھایا اور ان سے اثر بھی قبول کیا لیکن وہ ان کی شخصیت میں جذب نہ ہوئے - ان کی انفرادی حیثیت بدستور قائم رہی ، انھوں نے سرسید کے قرب میں سرسید کے

---

۱ - عبدالحلیم شرر ، مضامین شرر جلد سوم

اصلاحی خواب کی وساطت سے فکر و نظر کی نئی راہوں پر قدم رکھا یہ راہیں وقت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ ان کی نظر میں روشن سے روشن تر ہوتی چلی گئیں ۔ شبلی بھی سرسید کی طرح جامع الصفات شخصیت کے مالک تھے ۔ انھوں نے سرسید کے اصلاحی خواب کو اپنا خواب بنا لیا ، ”علی گڑھ پہنچ کر انھوں نے اپنی مولویت چھوڑی[۱] “ اور اس تنگ نائے سے نکل کر جدید اور وسیع تر دنیا میں آ گئے لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ دین سے ان کا جو رشتہ بچپن میں قائم ہو گیا تھا اس سے انھوں نے علیحدگی اختیار کرلی بلکہ ہوا یہ کہ انھوں نے دین کو اب ایک نئی نظر سے دیکھنا شروع کیا اور اسلام کو جدید دنیا کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوششوں میں مصروف ہوگئے ۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی ۱۸۸۷ع میں ”مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم“ کی شکل میں سامنے آئی ۔ سرسید نے انگریزی راج کے تحت مسلمانوں کو تعلیمی اعتبار سے دوسری اقوام کے ہم پلہ بنانے کا جو منصوبہ بنایا تھا اس سے ابتدا میں طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہوگئی تھیں ۔ یہاں تک کہ سرسید کو ملحد اور کافر تک کہا گیا اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ سرسید انھیں عیسائی بنانا چاہتے ہیں ۔ ایسے میں شبلی آگے بڑھے اور انھوں نے اپنے مضمون ”مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم“ کے ذریعے بھٹکے ہوئے مسلمانوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ سرسید انھیں عیسائی ہرگز نہیں بنا رہے بلکہ انھوں نے پرانے زمانے کی اسلامی تعلیم کو ذرا سی تجدیدی شکل دے دی ہے ۔ شبلی قدیم اور جدید کو خوش گوار امتزاج دینے میں بے مثل تھے ۔ انھوں نے اپنے

---

۱ ۔ مہدی حسن افادی : افاداتِ مہدی ، صفحہ ۳۰۲

اس مختصر سے مضمون میں اسلام کے ابتدائی ایام کے طریقۂ تعلیم، نصاب اور اس کے ارتقاء پر ایک اچھی سی نظر ڈالی ہے لیکن اختصار کے باوجود اس مضمون میں شبلی نے قدیم زمانے کے طریقۂ تعلیم کا ذکر ،کچھ اس عمدگی سے کیا ہے کہ اسے پڑھتے میں یہ محسوس ہوتا ہے جیسے شبلی قدیم زمانے کے طرزِ تعلیم کے بارے میں گفتگو نہیں کر رہے بلکہ ان کے پیشِ نظر اس طریقۂ تعلیم کا ذکر ہے جس سے ہم آپ ، آج فیض پا رہے ہیں - سرسید نے شبلی کا یہ مضمون دیکھا تو وہ خوشی کے مارے اچھل پڑے ، اپنے ایک دوست کو اس سلسلے میں لکھتے ہیں : ''نہایت عمدہ اور مفید چیز تیار ہو گئی[۱] -''

سرسید نے جہاں شبلی کو متاثر کیا وہاں وہ خود بھی ان کے تبحر علمی سے متاثر ہوئے ، چنانچہ ایک زمانے میں جب شبلی نے علی گڑھ کی نوکری چھوڑ کر ندوہ جانے کی خواہش ظاہر کی تو سرسید نے انھیں اپنی رائے بدلنے کا مشورہ دیا اور اپنی طرف سے پوری کوشش کرتے رہے کہ شبلی کا تعلق کسی نہ کسی طرح علی گڑھ سے قائم رہے - ایک جگہ خان بہادر ڈاکٹر شیخ عبداللہ نے اس قصے کا ذکر کیا ہے اُن کا بیان یہاں نقل کرنے کو جی چاہتا ہے کہ اس سے سرسید اور شبلی کے تعلقات پر بھی روشنی پڑتی ہے ، لکھتے ہیں : ''سرسید سے اور مولانا شبلی مرحوم سے ذاتی کوئی نقیض نہیں تھا اور نہ میرے علم میں سرسید اور مولانا مرحوم میں کوئی عداوت تھی. . . . جب مولانا نے اپنا یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ محمڈن کالج کی

---

۱ - خط نمبر ۲ ، بنام عمادالملک ، مکتوبات سرسید ، صفحہ ۲۳۹

نوکری چھوڑ دیں اور یہاں سے جاکر ندوۃ العلوم میں کام کریں تو مسٹر بیک پرنسپل کالج نے سرسید کو لکھا کہ مولانا شبلی کو روک لیا جائے کیوں کہ وہ تاریخی معاملات سے بہت واقفیت رکھتے ہیں اور ہمارے کالج کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے۔ اس لیے میں تجویز کرتا ہوں کہ مولانا کو سال بھر کی تنخواہ دی جایا کرے لیکن کام مولانا سے صرف چھ مہینے ہی لیا جاوے اور چھ ماہ کی رخصت دی جاوے تاکہ وہ ندوۃ العلماء کے کاموں میں چھ مہینے صرف کرسکیں۔

سرسید نے مذکورہ بالا تجویز کو بخوشی منظور کر لیا۔ اب اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا شبلی مرحوم اور سرسید میں کوئی نقیض نہیں تھا ورنہ سرسید خوش ہوتے کہ ایک مخالف یہاں سے جا رہا ہے۔''[1]

شیخ عبداللہ کے اس بیان سے شبلی اور سرسید کے تعلقات کا ایک پہلو سامنے آتا ہے۔ اُن دونوں کے تعلقات کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ شبلی سرسید کی دکھائی ہوئی راہ پر چلنے کو ایک فریضے کی حیثیت دیتے تھے، ان کی اکثر تصانیف کی بنیاد سرسید کے مشورے پر ہی رکھی گئی اور اُن کی تصانیف کے بعض منصوبوں کے رو بہ انجام پانے میں محض اس لیے دیر ہوئی کہ سرسید کی رائے ان کی تصنیف کے خلاف تھی۔ اس بات کا اعتراف مولانا سلیمان ندوی کو بھی ہے جنھوں نے سرسید اور شبلی کے مبینہ اختلافات کا مسئلہ کھڑا کیا ہے۔ الغزالی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں: ''اس کی تحریک ۱۸۹۲ء میں سرسید نے کی

۱۔ خان بہادر شیخ عبداللہ، شبلی نمبر، ادیب، علی گڑھ صفحہ ۳۱۵-۳۱۶

تھی[1] ۔" پھر وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ "الفاروق" کی تصنیف کچھ عرصے تک مولانا نے اس لیے روکے رکھی کہ سرسید یہ سمجھتے تھے کہ اس کی تصنیف سے کالج میں شیعہ سنّی تفرقہ پیدا ہو جائے گا[2]۔" انھیں اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ شبلی نے اپنا مشہور مضمون "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" سرسید کے مشورے پر لکھا تھا ۔ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر شبلی کو سرسید سے کسی قسم کے اختلافات تھے تو وہ ان کے کہنے پر اپنا تصنیف و تالیف کا کام کیوں روکتے ۔ شبلی اور سرسید کے تعلقات کے متعلق مختصر اشاروں کے مطالعے سے (جن کا ذکر مختصراً آئندہ صفحات میں آئے گا) یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان دونوں میں قطعاً کوئی اختلاف نہ تھا ۔ اختلافات جنھیں چشمکیں اور جھگڑے بھی کہا جا سکتا ہے صرف ان دونوں کے معتقدوں میں ہیں ، اگر ایک طرف سلیمان ندوی اور اقبال احمد سہیل نے اس پر اصرار کیا ہے کہ شبلی کو شبلی سرسید نے ہرگز نہیں بنایا تھا تو دوسری طرف امین زبیری اور ایس ۔ ایم ۔ اکرام نے غیر ضروری طور پر یہ ثابت کرنے کی پوری کوشش کی ہے کہ اگر سرسید نہ ہوتے تو شبلی بھی نہ ہوتے ۔

شبلی کے معتقدوں کو اس حقیقت کے اعتراف سے قطعی انکار ہے کہ شبلی نے سرسید یا علی گڑھ سے کوئی اثر قبول کیا ۔ چنانچہ جب سرسید کے ساتھیوں نے بڑے زور شور سے یہ نعرہ بلند کیا کہ شبلی کو شبلی علی گڑھ نے بنایا ہے تو

---

۱ ۔ سلیمان ندوی ، حیات شبلی صفحہ ۳۵۰

۲ ۔ ایضاً ، صفحہ ۲۳۱

علامہ شبلی کے شاگرد خاص مولانا سلیمان ندوی اس سے انکار کرتے ہوئے چلا اٹھے کہ یہ ہرگز درست نہیں ۔ اس سلسلے میں آن کی دلیل یہ تھی کہ اگر علی گڑھ' نے شبلی کو شبلی بنا دیا تو کیا وجہ ہے کہ اس بزم میں آ کر کسی اور کا قد و قامت نہیں بڑھا ۔ بات معقول ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ سوچنا بھی ضروری ہے کہ استاد اپنے ہر طالب علم کو ایک ہی چیز پڑھاتا ہے لیکن ان طالب علموں میں سے کچھ ایسے ہوتے ہیں جو امتحان میں اول درجے میں کامیاب ہوتے ہیں کچھ دوسرے میں اور کچھ تیسرے میں اور کچھ طالب علم ناکام بھی ہو جاتے ہیں ۔ ایسا صرف اس لیے ہوتا ہے کہ جس طالب علم میں جتنی استطاعت ہوتی ہے وہ اپنے استاد کی بتائی ہوئی بات سے اتنا ہی فیض اٹھاتا ہے ۔ یہی بات سرسید کے رفقاء پر صادق آتی ہے ۔ سرسید علم کا خزانہ تھے ، اس خزانے سے ہر ایک کو دولت بٹتی تھی ، اب یہ ان کے ساتھیوں کی جھولی پر منحصر تھا کہ کس کی جھولی میں کتنی سمائی یا گنجائش تھی ۔ شبلی اس دوڑ میں اپنے دوسرے ساتھیوں سے بہت آگے نکل گئے ۔

شبلی نقاد بھی تھے ، شاعر بھی ، وہ علم الکلام کے ماہر بھی تھے ، اور ایک جید عالم بھی ، سوانح نویس بھی تھے اور مورخ بھی ۔ اگر دیکھا جائے تو ان کی ان تمام حیثیتوں کا نکھار سرسید کے ہاتھوں ہوا لیکن آن کی جملہ حیثیات سے ہمیں یہاں غرض نہیں ، البتہ جہاں تک مورخ ہونے کا تعلق ہے شبلی

۱ - میرے نزدیک علی گڑھ اور سرسید ، ایک ہی چیز کے دو نام ہیں ۔ علی گڑھ کے بغیر سرسید کا تصور ناممکن ہے اور سرسید کے بغیر علی گڑھ کا ذکر لا حاصل ۔

یقیناً علی گڑھ یا سرسید ہی کے پروردہ ہیں ۔ اس بات کا اعتراف ڈھکے چھپے لفظوں میں آنھوں نے خود بھی کیا ہے اور اسے شعوری یا غیر شعوری طور پر کہیں کہیں سلیمان ندوی نے بھی تسلیم کیا ہے ۔ ایک جگہ شبلی نے خود لکھا ہے : ''تصانیف کا شوق ابتداً مجھے ان تاریخی تصنیفات کے دیکھنے سے ہوا تھا جو یورپ میں چھپی تھیں اور ایک موقع پر مجھ کو بہت سی یکجا ملی تھیں جن کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا[۱]۔'' ''یہ کتابیں سرسید کا کتب خانہ تھا[۲]۔''

مولانا سلیمان ندوی نے اس بات کے ماننے سے انکار کرکے کہ شبلی کو شبلی سرسید نے بنایا تھا ایک افسوس ناک جھگڑے کی بنیاد تو رکھ دی لیکن معلوم ہوتا ہے یہ بات انھوں نے محض وقتی اشتعال یا جھلاہٹ میں کہی تھی ، کیونکہ انھوں نے کئی جگہ کھلم کھلا یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ شبلی نے علی گڑھ یا سرسید کا زبردست اثر قبول کیا ۔ ایک جگہ رقم طراز ہیں : ''اب تک مولانا کا تاریخی ذوق نمایاں نہ تھا لیکن کالج پہنچنے کے ساتھ یکایک ان کا تاریخی ذوق ابھر آتا ہے . . . . . . جب وہ علی گڑھ پہنچے اور سرسید کے کتب خانے میں عربی، تاریخ اور جغرافیہ کی وہ نادر کتابیں ان کو نظر آئیں جو یورپ یا مصر و شام اور قسطنطنیہ میں چھپی تھیں تو ان کی آنکھیں کھل گئیں اور یہیں سے تاریخ اسلام کے مطالعہ کا نیا دور شروع ہوا[۳]۔'' یہیں پہنچ کر بقول میاں بشیر احمد ''سرسید کی صحبت میں ان

---

۱ ۔ خط نمبر ۱ بنام ایڈیٹر زمانہ کانپور ، مکاتیب شبلی جلد دوم صفحہ ۲۳۵

۲ ۔ حیات شبلی صفحہ ۱۳۷

۳ ۔ ایضاً صفحہ ۱۳۵-۱۳۶

پر جدید قومی رنگ چڑھا اور انھوں نے مشرقیت و مغربیت کے صحیح امتزاج کی خوبی اور سود مندی دیکھی اور اس ضمن میں ان کے مذہبی خیالات میں ایک ''نازک انقلاب'' واقع ہوا[1]۔" سرسید کی صحبت اور اثر نے شبلی کے ان اوصاف کو بیدار کردیا جو فطرتاً ان میں موجود تھے لیکن مذہبی لگن نے انھیں خوابیدہ کر رکھا تھا۔

اس سلسلے میں مولانا سلیمان ندوی کا ایک اور جملہ ملاحظہ فرمائیے جس سے ان کا فکری تضاد ظاہر ہوتا ہے، لکھتے ہیں: "کالج پہلا مقام تھا جہاں اس وقت مشرق و مغرب کے اساتذہ یکجا تھے اور ایک دوسرے کے خیالات و معلومات سے متاثر ہو رہے تھے۔ مولانا کو کالج آ کر سب سے بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ اُن کو یورپ کے خیالات اور علمی تحقیقات سے آگاہی کا موقع ملا[2]۔" یہ شبلی پر علی گڑھ کے اثرات کا واضح اعتراف ہے۔

مولانا سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں یہ بات بھی کھلم کھلا مانی ہے کہ ۱۸۹۲ع سے لے کر ۱۸۹۸ع تک مولانا کے قلم سے بہت سے محققانہ تاریخی مضامین نکلے[3]۔" یہ زمانہ شبلی کے علی گڑھ میں قیام کا ہے، ظاہر ہے جب سے شبلی علی گڑھ پہنچے تھے وہ آہستہ آہستہ علی گڑھ کا رنگ قبول کر رہے تھے حتیٰ کہ ۱۸۹۲ع میں وہ مذہب کے کوچے

---

۱ - میاں بشیر احمد، شبلی بحیثیت مصنف، ہمایوں لاہور ۱۹۳۰ع صفحہ ۱۵م

۲ - حیات شبلی صفحہ ۱۳۹

۳ - ایضاً صفحہ ۲۲۵

سے نکل کر تاریخ کی دنیا میں آ پہنچے۔

بات شروع میں ہی ختم ہو جاتی اگر شبلی کے وہ بیانات نقل کر دئیے جاتے جن سے ان کے علی گڑھ اور سرسید سے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے لیکن شبلی پر سرسید اور علی گڑھ کے ہونے والے اثرات کا ذکر اس لیے مولانا سلیمان ندوی ہی کے قلم سے واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ سرسید اور شبلی کے سلسلے میں پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کے پیدا کرنے میں اُن کا بڑا ہاتھ تھا۔

اب ذرا شبلی کی زبانی علی گڑھ اور سرسید کے قصیدے سنیے۔ سرسید کے بارے میں ان کے اشعار کو جانے دیجیے کہ شبلی کا کلیات سرسید کے قصیدوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس جگہ ان کی دو تقریروں کے اور ایک خط کے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

حیدر آباد دکن کے کسی جلسے کا ذکر ہے۔ وہاں شبلی اور سر سید دونوں موجود تھے۔ پہلے مولانا شبلی کی تقریر ہوئی انھوں نے تقریر ختم کرتے ہوئے سرسید کی عظمت کے اعتراف میں کہا: ”حضرات! سر سید احمد خاں کا لکچر اب ہو گا۔ میری تقریر اس وقت آپ لوگوں کو اس طرح معلوم ہو گی جیسے آفتاب کے سامنے ایک دھندلا سا چراغ رکھا جائے[۱]۔“ کیا شبلی کی یہ تحریر پڑھ کر بھی اس بات میں شک رہ جاتا ہے کہ وہ سر سید سے متاثر تھے۔ یہ ضرور ہے کہ ایک شخص کسی دوسرے شخص کی شخصیت کو بالکل بدل نہیں سکتا لیکن پھر بھی بعض لوگ اپنے سے بڑے آدمی

۱۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، شبلی نمبر، صبا حیدر آباد صفحہ ۳٦۰

کا اثر اس حد تک قبول کر لیتے ہیں کہ ان کی انفرادی حیثیت قائم نہیں رہتی - شبلی نے سرسید کا اثر قبول ضرور کیا - یہ بات شبلی کے پرستاروں کو بھی ماننی پڑے گی - فرق صرف یہ ہے کہ وہ سرسید کے اندھے مقلد نہیں بنے اور سر سید سے متاثر ہونے کے باوجود انھوں نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی - تاریخ کے سلسلے میں شبلی پر علی گڑھ کے اثرات کا اعتراف ایک جگہ اُن کے معتقد مولانا اقبال احمد سہیل نے یوں کیا ہے : "....غالباً سب سے بڑا احسان علی گڑھ کا یہ تھا کہ مولانا کا موضوعِ تصنیف بدل گیا - اگر اسی قدیم ماحول میں رہتے تو درسیات کے شروح یا فروعیات فقہی کے تنگ دائرے سے نکلنا شاید نصیب نہ ہوتا - یہاں آئے تو تاریخ اسلامی کے نا پیدا کنار میدان میں تگ و دو کا ولولہ پیدا ہوا[۱] -"

سر سید اور علی گڑھ سے متاثر ہونے کا اعتراف شبلی نے ایک اور جگہ یوں بھی کیا ہے :

"یہ سچ اور بالکل سچ ہے کہ میری زندگی کا کوئی حصہ علمی یا تعلیمی زندگی قرار دیا جا سکتا ہے تو اس کا آغاز ، اس کی نشو و نما ، اس کی ترقی ، اس کی نمود ، اس کا امتیاز جو کچھ ہوا اسی کالج سے ہوا ہے . . . . میں نے جو کچھ سیکھا ہے اور جو کچھ ترقی کی ہے وہ اسی کالج کی بدولت ہے - اس لحاظ سے میں جس طرح اس کالج کا پروفیسر ہوں اسی طرح اس کا ایک تربیت یافتہ شاگرد بھی ہوں . . . .

---

۱ - منقول از شبلی نامہ ، مصنفہ ایس - ایم - اکرام صفحہ ۵۷

آپ یہ نہ خیال فرمائیں کہ یہ کالج صرف طالب علموں اور اسٹوڈنٹس کو ترقی دلاتا ہے بلکہ وہ پروفیسروں اور ماسٹروں کی علمی و روحانی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اگر وہ طالب علموں کو بی۔اے اور ایم۔اے کی ڈگریاں دیتا ہے تو پروفیسروں اور ماسٹروں کو شمس العلماء کر سکتا ہے[۱]۔"

اور ایک خط میں نواب سید علی حسن خاں کو لکھتے ہیں:

نمی دانم حدیثِ نامہ چوں است
ہمیں دانم کہ عنوانش بہ خوں است

قومی عمارت کے ستون ہل گئے یعنی سید احمد خاں بہادر اپنے پروردگار کے جوار رحمت میں گئے اور یہ سانحہ یک شنبہ ۲۷ مارچ کو پیش آیا اور ہماری قوم کا شیرازہ بکھر گیا۔ میں کچھ دنوں تک کوئی کام نہیں کر سکتا مگر کچھ زمانہ گذرنے پر۔ والسلام شبلی نعمانی۔ علی گڑھ ۲۹ مارچ ۱۸۹۸ع[۲]۔"

یہ خط ۲۹ مارچ ۱۸۹۸ع کو یعنی سر سید کی وفات سے صرف دو دن بعد لکھا گیا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ

۱۔ یہ اقتباس مولانا کی اس تقریر کا ہے جو انھوں نے شمس العلماء کا خطاب پانے کے بعد ۱۸۹۴ع میں کی تھی، اقتباس علی گڑھ میگزین کے "علی گڑھ نمبر" سے نقل کیا گیا۔
حصہ دوم (صفحہ ۲۴)

۲۔ اصل خط عربی میں ہے جس پہ فارسی کا وہ شعر لکھا ہوا ہے جو اوپر نقل ہوا ہے بقیہ خط اصل صورت میں
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

سر سید کی وفات تک شبلی اور سر سید دونوں میں نہایت خوش گوار تعلقات تھے یہاں تک کہ جیسا کہ خط سے واضح ہوتا ہے ، ایک کی وفات نے دوسرے کو اس درجہ متاثر اور مغموم کیا کہ وہ کچھ دن تک کوئی کام کرنے کے قابل بھی نہ رہے -

معلوم نہیں کیوں ان سب باتوں کو دیکھنے کے باوجود مولانا سلیمان ندوی نے سر سید اور شبلی کے اختلافات پر اتنا زور دیا ہے - شاید جیسا کہ امین زبیری کا خیال ہے وہ اس لیے غلط فہمی میں مبتلا ہوئے کہ شبلی نے سر سید کی وفات پر کوئی مرثیہ نہیں لکھا تھا - اس سلسلے میں ایک جگہ مولانا سلیمان ندوی رقم طراز ہیں : ''اس موقع پر یہ بات تعجب سے دیکھی جائے گی کہ جس کی مدح انھوں نے پہلے کئی دفعہ لکھی اس کے مرثیہ میں ایک شعر بھی انھوں نے نہیں کہا[1] -'' غالباً یہی غلط فہمی اس سارے جھگڑے کی بنیاد بنی -

یہ بات تو اس خط سے جو ہم نے چند سطر پہلے نقل کیا ، واضح ہو چکی ہے کہ سر سید کی وفات سے شبلی کے دل پر ایسی چوٹ لگی تھی کہ وہ کچھ لکھنے لکھانے کے قابل

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

یوں ہے - ''تزعزعت ارکان الملتہ ! اعنی انتقال السید احمد خان بہادر الی جوار رحمتہ ربہ ، و ذلک یوم الاحد ۲۷ مارچ و تفرق شملنا انی لا اقدر علی ان اشتغل بشی الا بعد برہتہ من الزمان'' والسلام شبلی نعمانی علی گڑھ

۲۹ مارچ ۱۸۹۸ع

عربی خط نمبر ۲ بنام نواب سید علی حسن خاں ، مکاتیب شبلی جلد دوم صفحہ ۲۶۱

۱ - حیات شبلی صفحہ ۳۳۲

نہ رہے تھے ، مرثیہ لکھتے تو کیا لکھتے ؟

ایک جگہ مولانا سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ جب مولانا سلام ندوی نے شبلی کے بھائی مہدی کی وفات پر ان سے مہدی کا مرثیہ نہ لکھنے کی وجہ پوچھی تو انھوں نے کہا ''حواس کب بجا تھے[۱]۔''

مولانا سلیمان ندوی نے مہدی کی وفات پر تو شبلی کا یہ عذر قبول کر لیا لیکن معلوم نہیں کیوں سر سید کے معاملے میں ان کی نظر اس حقیقت کی طرف نہیں گئی ۔

اس طول طویل بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شبلی اور سر سید میں ذاتی طور پر کسی قسم کا اختلاف نہیں تھا ۔ بلکہ یہ من گھڑت اختلافات ، شبلی اور سر سید کے معتقدوں اور پرستاروں کے پیدا کیے ہوئے ہیں ۔ شبلی نے بہت کچھ سر سید سے سیکھا اور تھوڑا بہت سر سید نے بھی ان سے فیض اٹھایا ۔ شبلی کو سر سید سے جدا کر دیا جائے تو وہ واقعی شبلی نہیں رہتے ۔ علی گڑھ آنے سے پہلے وہ کٹر قسم کے مولوی تھے ، سر سید کی صحبت نے انھیں زمانے کے جدید تقاضوں سے روشناس کرایا ۔ یہیں انھوں نے اپنی تاریخ نویسی کا آغاز کیا اور یہیں وہ اردو کے تاریخ نویسوں کے امام بنے ۔ سر سید اور علی گڑھ سے جدائی کے بعد بھی وہ انھی راہوں پہ چلتے رہے جن کی نشاندہی علی گڑھ میں ہوئی تھی ، تاریخ نویسی کا بنیادی تصور ہی انھیں علی گڑھ نے دیا اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ مورخ شبلی یقیناً علی گڑھ میں پیدا ہوئے اور وہیں پروان چڑھے ۔

---

۱ ۔ حیات شبلی صفحہ ۷۷۶

۱۸۸۹ء میں شبلی نے اپنا مشہور مضمون ''الجزیہ''لکھا ۔ اس مضمون کی وجہ تصنیف یہ ہے کہ ایک عرصے سے غیر مسلم مسلمانوں پر یہ الزام عائد کرتے چلے آئے تھے کہ وہ اپنی غیر مسلم رعایا پر جزیہ اس لیے عائد کرتے تھے کہ اُن کی غیر مسلم رعایا اس رقم کی ادائیگی سے بچنے کے لیے اسلام قبول کر لے ۔ شبلی نے تحقیق و تدقیق سے اپنے اس مضمون میں یہ ثابت کیا ہے کہ جزیہ ظلم کا نہیں بلکہ رحمدلی کا نشان ہے ، اور مسلمان بادشاہ تھوڑی سی رقم کے بدلے غیر مسلموں کو وہ وہ رعایتیں دیتے ہیں جن کا تصور کسی اور مذہب کے حکمرانوں کی زندگی میں نہیں ملتا ۔ اسی ضمن میں غیر مسلموں کو دی جانے والی رعایتوں کی مزید وضاحت کرنے کے لیے اُنھوں نے ایک اور مضمون "حقوق الذمین" کے نام سے لکھا ۔ ان کا خیال تھا کہ "ذمیوں کے حقوق کا مسئلہ ایسا مہتم بالشان اور وسیع ہے کہ اگر اس کا قطعی فیصلہ کر دیا جائے تو یورپ کی غلط فہمیوں کا سارا طلسم ٹوٹ جائے گا[1] ۔"

اسی طرح کی ایک اور غلط فہمی دور کرنے کے لیے ۱۸۹۲ء میں اُنھوں نے ایک بلند پایہ تحقیقی مضمون ''کتب خانۂ اسکندریہ'' لکھا ۔ مسلمانوں پر غیر مسلم ایک الزام یہ بھی عائد کیا کرتے ہیں کہ وہ علم کے دشمن ہیں ۔ اسے ثابت کرنے کے لیے مثال یہ پیش کی جاتی ہے کہ جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں مسلمانوں نے مصر اور اسکندریہ فتح کیا تو وہاں کے مشہور یونانی کتب خانے کو جو وہاں

---

۱ - شبلی نعمانی، حقوق الذمین (رسائل شبلی) صفحہ ۴۳

بطلیموسیوں کے زمانے سے قائم تھا جلا کر خاک کر دیا ۔ اگر کوئی تن آساں یا سہل انگار مورخ ہوتا تو بقول شخصے جھوٹ سچ کے قلابے ملا کر ثابت کرنے کی کوشش کرتا کہ ہر خرافات یا بے ہودہ مجموعۂ کتب علمی خزانہ نہیں کہلا سکتا لیکن مولانا شبلی صحیح معنوں میں محقق اور مورخ تھے ۔ انھوں نے تاریخی تحقیقات سے یہ ثابت کیا کہ یہ الزام سراسر غلط اور بے بنیاد ہے ۔ مسلمانوں سے اسکندریہ کے کتب خانے کی تباہی کا کوئی تعلق نہ تھا بلکہ اس کتب خانے کو نذر آتش کرنے والے خود عیسائی تھے ۔

شبلی کے یہ دونوں مضامین ، سرسید کی نظر سے گزرے تو ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ''یورپ نے اسلام اور مسلمانوں کی نسبت جو تاریخی غلط فہمیاں پھیلائی ہیں ان کے جواب اور تصحیح کے لیے ایک مجلس بنائی جائے[۱] ۔'' چنانچہ ۱۸۹۲ع کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں سرسید نے اس کا اعلان کیا اور مولانا شبلی کے مضامین کو اس سلسلے کے مضامین میں داخل کرنے کے علاوہ مولانا کو اس صیغے کا سیکرٹری بنا دیا ۔ اس مجلس کے قیام نے شبلی کو اسلام کی خدمت اور اپنے مورخانہ و محققانہ شوق کو پورا کرنے کا ایک اور موقع فراہم کردیا ۔ اس کے بعد ۱۸۹۲ع سے ۱۸۹۸ع تک شبلی نے بے شمار تحقیقی مضامین لکھے، جن میں اسلامی شفا خانے، اسلامی کتب خانے، حقوق الذمین ، مکینکس اور مسلمان اور اسلامی مدارس وغیرہ خاص طور پر اہم ہیں ۔ علی گڑھ کے قیام کے دوران میں وہ برابر اس سلسلے میں بر سر پیکار رہے ۔ علی گڑھ سے علیحدگی کے

---

۱ ۔ حیات شبلی صفحہ ۱۶۱

بعد بھی آن کی نظر میں یورپی مورخوں کی یہ بد طینتی برابر کھٹکتی رہتی تھی کہ وہ مسلمانوں کے اسلاف کو ان کی نظر سے گرانے کے لیے آئے دن ان کے خلاف زہر اگلتے رہتے تھے۔ شبلی نے ان کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے کام کو اپنے لیے عبادت اور ان کی درستی کو ریاضت کا درجہ دیا۔ چنانچہ علی گڑھ سے علیحدگی کے بعد بھی ان کی نظر میں ایک صیغۂ اصلاح اغلاطِ تاریخی کی ضرورت قائم رہی۔ اور انھوں نے ۱۹۱۰ع میں ''ایک صیغہ تصحیحِ اغلاطِ تاریخی'' قائم کیا جس کا سیکرٹری مولانا سلیمان ندوی کو بنایا گیا۔ اس صیغے کا ذکر کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں: ''کیوں کہ انگریزوں نے ہندوستان کا تخت مسلمانوں سے چھینا تھا اس لیے انھوں نے زیرِ درس اسلامی تاریخ کو ایسے رنگ میں لکھ کر پیش کیا کہ اس سے دو نتیجے نکلیں۔ ایک یہ کہ مسلمان طلبہ ان کے بیانات کو سچ سمجھ کر اپنے اسلاف اور بزرگوں کے کارناموں سے خود شرمانے لگیں اور دوسرے یہ کہ ہندوستان کی مختلف قوموں کے طالب علموں میں تعصب اور بغض و عداوت کے جذبات پیدا ہوجائیں۔ ان غلط فہیوں کو دور کرنے کے لیے شبلی نے ایک صیغہ قائم کیا جس کا سیکرٹری خاکسار (سلیمان ندوی) کو مقرر کیا گیا[۱]۔''

''اس صیغے کے قائم ہو جانے کے بعد مختلف یونیورسٹیوں کے مسلمان پروفیسروں سے اس سلسلے میں خط و کتابت کی گئی اور ان سے ایسی اغلاط کے بارے میں مشورہ طلب کیا گیا۔ اخباروں

۱۔ حیات شبلی صفحہ ۲۵ــــ۵۲۴

کے ذریعے بھی لوگوں سے قابلِ اعتراض کتابوں کے نام دریافت کیے گئے اور قابل اعتراض کتابوں کو یونیورسٹیوں کے نصاب سے خارج کرنے کی درخواست کی گئی - جن کتابوں میں تصحیح کی گنجائش تھی انھیں تصحیح کر کے ٹھیک کرایا گیا - اس سلسلے میں مارسڈن (Marsden) کی تاریخ ہندوستان اور ڈیلافوس (Delafoce) کی تاریخ ہند کے خلاف خاص اقدامات کیے گئے[1] -"

اس صیغے کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ تاریخ کے معاملے میں شبلی کی کوششیں صرف قلمی کاوش تک محدود نہیں تھیں بلکہ عملی اقدامات بھی ان کے دائرۂ کار میں شامل تھے -

شبلی کی شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں میں ، مورخ شبلی نے اتنی اہمیت حاصل کرلی ہے کہ آن کی شخصیت کے دوسرے پہلو اس کے مقابلے میں مدھم پڑ کر رہ گئے ہیں ، یہی وجہ ہے کہ ان کے سب سے بڑے پرستار مہدی افادی نے بھی جو انھیں ''خاتم المصنفین'' اور ''مورخ اسلام'' کے نام سے یاد کرتے ہیں یہ تسلیم کرلیا تھا کہ ''شبلی سے اگر تاریخی کتب لے لیجیے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے[2] -"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مورخ شبلی کو اس کی عظمت کے باوجود شبلی کی شخصیت کے دوسرے پہلوؤں سے الگ نہیں کیا جا سکتا - ان کی شخصیت کے مختلف پہلو فنی اعتبار سے ایک دوسرے کے ہمسر نہ ہونے کے باوجود ایک دوسرے میں اس حد تک پیوست ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں

---

۱ - حیات شبلی صفحہ ۵۲۵

۲ - مہدی افادی ، افادات مہدی صفحہ ۲۱۲

کیسے جاسکتے - شاعر شبلی کو مورخ شبلی سے ، نقاد شبلی کو عالم شبلی سے، متکلم شبلی کو سوانخ نگار شبلی سے علیحدہ کر کے دیکھنا حقائق کی طرف سے چشم پوشی ہے - وہ مورخ کے نقاب میں شاعر ہیں ، شاعر کے نقاب میں مورخ ، نقاد کے روپ میں عالم ہیں ، عالم کے روپ میں نقاد، متکلم کے لباس میں سوانخ نگار ہیں اور سوانخ نگار کے لباس میں متکلم - وہ شاعری کرتے ہیں تو مورخ شبلی بار بار انھیں اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہتا ہے اور جب وہ مورخ کا روپ دھارتے ہیں تو یہ کام شبلی کی شخصیت کے دوسرے پہلو اپنے ذمہ لے لیتے ہیں ، یہی صورت اپنی باری آنے پر محقق و نقاد ، سوانخ نگار و متکلم اور عالم و انشا پرداز شبلی کے ساتھ پیش آتی ہے - چنانچہ جن دنوں شبلی شعر العجم لکھ رہے تھے ان دنوں بھی سوانخ نگار و مورخ شبلی ان کے آس پاس ہی منڈلاتے رہتے تھے ، کام کرتے کرتے کہیں نقاد شبلی کو تھکن محسوس ہوتی تو مورخ و سوانخ نگار شبلی قلم سنبھال لیتے - ان کی گلکاریاں شعرالعجم کے سیکڑوں صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں - بعض بعض جگہ مثلاً سعدی ، فردوسی ، نظامی گنجوی اور حافظ شیرازی وغیرہ کا ذکر ہوتے وقت دور دور تک نقاد شبلی نظر نہیں آتے -

یہی حال مورخ شبلی کا بھی ہے - شبلی کے پاس مورخ کے دماغ کے ساتھ شاعر کا ذہن اور دل بھی ہے ، اس لیے کبھی کبھی شاعر شبلی ، مورخ شبلی کے معاملات میں دخل اندازی شروع کر دیتا ہے اور شبلی شاعر کی شکل میں سامنے آ جاتے ہیں ، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اپنے شاعرانہ ذوق کی تسکین کے لیے کبھی فن تاریخ نویسی کو بالائے طاق رکھتے ہوں، جونہی مورخ شبلی کو احساس ہوتا

ہے کہ شاعر یا انشا پرداز شبلی نے اس کا منصب چھیننا چاہا ہے وہ چونک اٹھتا ہے ، اسے چونکتا دیکھ کر انشاءپرداز اور شاعر شبلی خود ہی اپنی راہ لیتے ہیں۔ شبلی کی مورخانہ کاوشوں کے دوران میں شاعر و انشاء پرداز شبلی نے جو کار گزاری دکھائی اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیے، پیغمبرِ اسلام کی ولادت با سعادت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''آج کی صبح وہی صبح جانواز ، وہی ساعت ہمایوں ، وہی دور فرخ فال ہے ، ارباب سیر اپنے محدود پیرایہ بیان و زبان میں لکھتے ہیں کہ آج کی رات ایوان کسریٰ کے چودہ کنگرے گر گئے، آتش کدۂ فارس بجھ گیا ، دریائے سادہ خشک ہوگیا لیکن سچ یہ ہے کہ ایوان کسریٰ نہیں بلکہ شانِ عجم ، شوکتِ روم اوجِ چین کے قصر ہائے فلک بوس گر پڑے ، آتشِ فارس نہیں جحیمِ شر، آتش کدۂ کفر ، آذر کدۂ گمرہی سرد ہوکر رہ گئے ۔ صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی ، بت کدے خاک میں مل گئے ، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا ۔ نصرانیت کے اوراقِ خزاں دیدہ ایک ایک کرکے جھڑ گئے، توحید کا غلغلہ اٹھا ، چمنستان سعادت میں بہار آ گئی، آفتاب ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں ، اخلاق انسانی کا آئینہ پرتو قدس سے چمک اٹھا' ۔''

شبلی کو اردو کا پہلا فلسفی مورخ کہا گیا ہے ، اور یہ بات ہے بھی سچ ۔ وہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو میں اول اول باقاعدہ تاریخ نویسی کے اصول اور قاعدے مرتب کیے اور انہیں عملی طور پر اپنی تصانیف میں برتا بھی ۔

ان کے نزدیک ''تاریخ عالم کا ہر واقعہ بہت سے مختلف

---

۱ ۔ شبلی ، سیرت النبی جلد اول صفحہ ۱۷۰

واقعات کے سلسلے میں بندھا ہوا ہے ، انھیں ریشہ دوانیوں کا پتہ لگانا اور ان سے فلسفیانہ نکتہ سنجی کے ساتھ تاریخی نتائج کا مستنبط کرنا یہی چیز ہے جو علم تاریخ کی جان اور روح ہے[۱] ۔"

فلسفیانہ نکتہ سنجی سے تاریخی نتائج نکالنے کے لیے شبلی نے دو وسائل اختیار کیے ہیں ، روایت اور درایت ۔

روایت سے شبلی کی مراد یہ ہے کہ جو بھی واقعہ بیان کیا جائے ، اسی شخص کی وساطت سے بیان کیا جائے جس کا خود بیان کیے جانے والے واقعے سے تعلق ہو اور اس سے لے کر آخری راوی تک روایت کا سلسلہ متصل بیان کیا جائے ، اس کے ساتھ تمام راویوں کے بارے میں یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ وہ صحیح الروایت اور ضابطہ تھے یا نہیں[۲] ۔"

درایت سے شبلی یہ مراد لیتے ہیں کہ عقلی اصولوں سے واقعے کی تنقید کی جائے[۳] ۔ یہ عقلی اصول کیا ہیں ، شبلی نے ان کی بھی وضاحت کر دی ہے ، کہتے ہیں ، "درایت کے فن کے جو اصول و قاعدے ہمارے کام آ سکتے ہیں وہ یہ ہیں :

۱ ۔ جس واقعے کا ذکر ہو رہا ہے وہ اصول عادت کی رو سے ممکن ہے یا نہیں ۔

۲ ۔ جس زمانے کا واقعہ ہے اس زمانے میں لوگوں کی عادات اور میلانات واقعے کے مخالف تھے یا موافق ۔

۳ ۔ واقعہ اگر کسی حد تک غیر معمولی ہے تو اسی نسبت سے ثبوت کے طور پر جو شہادت دی جا رہی ہے قوی ہے یا نہیں ۔

---

۱ ۔ المامون صفحہ ۶

۲ ۔ الفاروق صفحہ ۱۶

۳ ۔ ایضاً

۴ - اس امر کی تفتیش بھی شبلی ضروری جانتے ہیں کہ راوی کے قیاسات اور رائے کا واقعے میں کہاں تک دخل ہے ؟

۵ - شبلی اس چھان پھٹک کو بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ راوی نے واقعہ جس صورت میں بیان کیا وہ واقعے کی پوری تفصیل ہے کہ نہیں ، کہیں ایسا تو نہیں کہ راوی واقعے کے کسی حصے کو نظر انداز کر گیا ہو -

۶ - شبلی اس بات کے اندازے کو بھی نہایت ضروری سمجھتے ہیں کہ زمانے کی بدلتی ہوئی اشکال اور مختلف راویوں کے طریقۂ ادا نے روایت میں کیا کیا اور کس کس طرح کی تبدیلیاں پیدا کر دیں[1] -

شبلی تاریخ لکھنے کے لیے ایک خاص قسم کے طرز تحریر کی اہمیت پر بھی زور دیتے ہیں ، ان کا کہنا ہے کہ "مورخ کا اصلی فرض یہ ہے کہ وہ سادہ واقعہ نگاری کی حد سے تجاوز نہ کرنے پائے[2] -" ان کے نزدیک "تاریخ اور انشا پردازی کی حدیں بالکل جدا جدا ہیں[3] -" تاریخ اور انشا کے باہم فرق کی وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں : ''ان دونوں میں فرق نقشہ اور تصویر کے فرق کے مشابہ ہے ، نقشہ کھینچنے والے کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ نقشہ کھینچے تو نہایت دیدہ ریزی کے ساتھ ، حتٰی کہ وہ جس چیز کا نقشہ کھینچ رہا ہو اس کی ہئیت ، شکل، سمت ، جہت ، اطراف ، اضلاع ایک ایک چیز کا احاطہ کرے - بخلاف اس کے مصور صرف ان ہی خصوصیتوں کو لے گا یا ان کو نمایاں صورت میں دکھائے گا جن میں کوئی خاص عجوبگی

---

۱ - الفاروق صفحہ ۱۸
۲ - ایضاً صفحہ ۹
۳ - ایضاً صفحہ ۲۰

ہوا[1] ۔" تاریخ صرف عجائبات زمانہ کے ذکر کا نام نہیں بلکہ یہ وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا دوسرا نام ہے ، یہ بات شبلی کی نظر میں بڑی واضح ہے اسی لیے انھوں نے مورخ کے فرائض مصور کے بجائے نقشہ نویس سے ملتے جلتے بتاتے ہیں ۔

تاریخ نویسی کے لیے غیر جانبداری رگ جاں کی حیثیت رکھتی ہے ۔ شبلی مورخ کی غیر جانبداری کے اس حد تک قائل ہیں کہ وہ مورخ کو مشورہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اگر سچی بات کہنے کے لیے مورخ کو مذہب بھی قربان کرنا پڑے تو اسے جھجکنا نہیں چاہیے ، اسلامی مورخ طرفداری سے الگ رہتا ہے ، وہ واقعات کی غیر جانبدارانہ تلاش میں اس بات کی پرواہ نہیں کرتا کہ اس کا اثر اس کے مذہب ، اعتقادات اور قومیت پر بھی پڑے گا یا نہیں[2] ۔"

ایک جگہ قدیم زمانے کی تاریخوں کا ذکر کرتے ہوئے شبلی نے لکھا ہے : "ان تمام کتابوں کو پڑھ کر اگر یہ معلوم کرنا چاہو کہ فلاں عہد میں طریق تمدن اور طرز معاشرت کیا تھے ، حکومت اور فیصل مقدمات کے کیا آئین تھے ، خراج ملک کیا تھا ، فوجی قوت کس قدر تھی ، ملکی عہدے کیا کیا تھے ، تو ان باتوں سے ایک کا پتہ لگنا بھی مشکل ہوگا ۔ خود فرمانروائے وقت کے طور و طریقے اور عام عادات و اخلاق کا اندازہ کرنا چاہو تو وہ جزئی حالات اور مفید تفصیلیں نہ ملیں گی جن سے اس کی اخلاقی تصویر ایک بار آنکھوں کے سامنے آ جائے ۔ جن واقعات کو بہت بڑھا کر لکھا ہے اور

---

۱ ۔ الفاروق ، صفحہ ۲۰

۲ ۔ سیرت النبی (جلد اول) صفحہ ۵۸

ہزاروں صفحے اس کی نذر کر دیے ہیں وہ صرف تخت نشینی ، خانہ جنگیاں ، فتوحات ملکی ، اندرونی بغاوتیں عمال کے عزل و نسب کے حالات ہیں[1] ۔"

ایک اور جگہ رقم طراز ہیں ۔ "آج دنیا میں جو تمدن معاشرت ، خیالات اور مذاہب موجود ہیں سب گزشتہ واقعات کے نتائج ہیں جو خواہ مخواہ ان سے پیدا ہونے چاہیے تھے اس لیے ان گزشتہ واقعات کا پتہ لگانا اور ان کو اس طرح ترتیب دینا جس سے ظاہر ہو کہ موجودہ واقعہ گزشتہ واقعات سے کیوں کر پیدا ہوا ۔ اسی کا نام تاریخ ہے[2] ۔"

شبلی کے ان اقتباسات کو پڑھنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ محض تخت نشینی کے حالات اور واقعات کو تاریخ نہیں سمجھتے بلکہ وہ تاریخ میں تمدن ، معاشرت ، مذہبی امور اور لوگوں کی عادتوں کے ذکر کو نہایت ضروری سمجھتے ہیں ۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں : "جس عہد کا حال لکھا جائے ، اس زمانے کے ہر قسم کے واقعات قلمبند کرنے چاہیے یعنی تمدن ، معاشرت ، اخلاق ، عادات ، مذہب ہر چیز کے متعلق معلومات کا سرمایہ مہیا کرنا چاہیے[3] ۔"

شبلی کسی بات کو تحقیق ، تدقیق اور تعدیل کے بغیر نہیں مانتے ، ان کا کہنا ہے کہ تاریخ نویسی کے لیے یہ دونوں چیزیں جزوِ ایمان کی حیثیت رکھتی ہیں، جرح و جستجو کی یہ عادت اس حد تک جا پہنچی ہے کہ شبلی یہ سمجھنے لگے ہیں کہ مورخ

---

۱ ۔ المامون صفحہ ٦

۲ ۔ الفاروق صفحہ ١٥

۳ ۔ ایضاً

کی ناواقفیت کی وجہ سے غلط باتیں لکھ جانے کا بھی امکان ہوتا ہے ، اسی لیے وہ کہتے ہیں : ''تاریخ میں جو واقعات مذکور ہوتے ہیں ان کو مختلف فنون سے رابطہ ہوتا ہے مثلاً لڑائی کے واقعات فن حرب سے ، انتظامی امور قانون سے اور اخلاق تذکرے علم اخلاق سے تعلق رکھتے ہیں - مورخ اگر ان تمام کا ماہر ہو تو واقعات کو علمی حیثیت سے دیکھ سکتا ہے ورنہ اس کی نظر سرسری اور سطحی ہو گی[1] -"

یہی اصول شبلی کی داستانِ تاریخ نویسی کی ابتداء اور آغاز ہیں اور یہی اس کی انتہا و انجام - شبلی تاریخ لکھتے ہوں تو یہی اصول ان کے لیے ریل کی پٹری کا کام دیتے ہیں ، انہیں ہر دم خدشہ رہتا ہے کہ اگر گاڑی ریل کی اس پٹری سے اتر گئی تو انجام جو کچھ بھی ہو اچھا نہیں ہو گا - وہ پوری احتیاط سے کام لیتے ہیں کہ کوئی حادثہ نہ پیش آ جائے لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی دبے پاؤں نکل کر ِادھر اُدھر جھانک لیتے ہیں - کہیں کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ تحقیق و تعدیل کے تقاضوں کے خلاف تاویلیں شروع کر دیتے ہیں مثلاً مامون پر یہ الزام رکھا گیا ہے کہ اس نے ذوالیمینیں طاہر کو زہر دلوا کر ختم کرایا - شبلی نے اس الزام کا ذکر کرتے ہوئے اسے تسلیم کرنے یا رد کرنے کے لیے کسی تحقیق و جستجو کی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ صرف یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ طاہر کو زہر دیا گیا اور خود مامون نے زہر دلوایا لیکن اگر مامون کی جگہ کوئی دوسرا بادشاہ ہوتا تو کیا کرتا[2] -"

---

۱ - الفاروق ، صفحہ ۱۵

۲ - المامون صفحہ ۷۰

اسی طرح جب شبلی کسی محل کی آرام و آرائش بھری دنیا میں پہنچتے ہیں تو ان کا دل محلوں میں بولی جانے والی زبان میں باتیں کرنے کو مچلنے لگتا ہے، وہ بے چین ہو کر تاریخ نویسی کے لیے سادہ طرز تحریر کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے بھی محل کی زبان میں باتیں کرنا شروع کر دیتے ہیں مثال کے طور پر المامون ہی کی چند سطریں ملاحظہ فرمائیے:
''ہارون بستر خواب پر سو رہا تھا کہ وزیر اعظم یحییٰ نے جگا کر مژدۂ خلافت سنایا۔ ہارون نے نہایت یاس سے کہا: ''دیکھو! تم ہنسی کرتے ہو بھائی صاحب سن لیں گے تو یہی ہنسی بلائے جان ہوگی۔'' یحییٰ نے عرض کیا: ''قضائے الٰہی نے اس بحث کا فیصلہ کر دیا آپ اطمینان سے سریرِ خلافت کو زینت دیں۔'' اسی گفتگو میں خواص مژدہ لائی کہ مشکوئے معلّی میں وارث تخت و تاج پیدا ہوا۔'' یہی وہ مبارک فال لڑکا تھا جس کی قسمت میں مامون الرشید اعظم ہونا لکھا تھا[1]۔'' مامون بڑا ہوا تو ہارون نے اس کی تعلیم و تربیت کے لیے مالک بن انس سے درخواست کی۔ ''حریم خلافت میں قدم رنجہ فرما کر شہزادوں کو علم حدیث پڑھائیں[2]۔'' وغیرہ وغیرہ

گنتی کی ان بے تدبیریوں کو چھوڑ کر شبلی کی پوری تصانیف چھان ڈالیے وہ کہیں اپنے اصولوں کی طرف سے غافل نظر نہیں آتے۔ ان کی محنت، مشقت اور جستجو کا یہ عالم ہے کہ برابر اس کوشش میں مصروف رہتے ہیں کہ وہ جس موضوع پر بھی لکھ رہے ہوں اس موضوع پر لکھی جانے والی

۱۔ المامون صفحہ ۱۴
۲۔ ایضاً صفحہ ۱۷

کوئی کتاب ان کی نظر سے رہ نہ جائے۔ اردو ، فارسی اور عربی کے تو وہ خود عالم تھے ، ان کے علاوہ دوسری زبانوں میں ملنے والے مواد کی تلاش میں بھی برابر لگے رہتے تھے ، انگریزی خود سمجھ میں نہ آتی تھی تو کتابوں کا ترجمہ اپنے دوستوں اور شاگردوں سے کروا کر اپنا کام نکالتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ کسی کتاب کی تلاش میں مہینوں اپنا کام اٹھا رکھتے تھے، چنانچہ تاریخ طبری نہ ملنے کی وجہ سے ایک عرصے تک انھوں نے الفاروق کی تصنیف روکے رکھی۔ انھیں اپنی تصانیف کی ضخامت سے غرض نہیں ہوتی تھی ان میں پیش کیے جانے والے مواد سے بحث ہوتی تھی ، ''ان کی زندگی کی یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ باوجود نہایت ضخیم کتابیں تالیف کرنے کے اور کثیر التصانیف ہونے کے وہ کسی دن بھی فلسکیپ کے دو یا تین صفحے سے زیادہ نہیں لکھتے تھے ، زیادہ وقت مطالعہ میں اور زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی گھنٹے لکھنے میں صرف کرتے تھے[۱]۔''

شبلی کی اسی محنت ، مشقت اور ریاضت کا نتیجہ ہے کہ ان کے دشمن بھی ان کی عظمت کے قائل اور اُن کی تصانیف کی اہمیت کے معترف ہیں۔ ایس۔ ایم۔ اکرام نے اپنی تصانیف ''شبلی نامہ'' اور ''موج کوثر'' میں شبلی کے خلاف جو کچھ لکھا ہے اس کا نشانہ زیادہ تر شبلی کی ذات بنی ہے۔ اُن کے فن اور خاص طور پر اُن کی تاریخ نویسی کے فن کے بارے میں انھوں نے بہت کم کچھ کہا ہے ، اس لیے یہاں اس کا ذکر

۱ - میاں بشیر احمد ''شبلی بحیثیت مصنف'' ''ہمایوں'' لاہور ، مئی ۱۹۳۰ء صفحہ ۳۵۲

ضروری نہیں البتہ یہ ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اپنی شبلی دشمنی کے باوجود ایس۔ ایم۔ اکرام نے بھی یہ مانا ہے کہ "سرسید کے حلقے میں پیر میکدہ کے بعد شبلی جیسی جامع الصفات ہستی کوئی نہ تھی [۱]۔" انھیں اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ "قلیل مدتِ حیات اور کمزوریٔ صحت کے باوجود شبلی نے جو کچھ کر دکھایا وہ ایک معجزے سے کم نہیں [۲]۔" یقیناً یہ بات قطعاً درست ہے، بلا شبہ شبلی نے اردو ادب کو، جتنا کچھ دیا اُس کی مثالیں ہمارے یہاں بہت کم ہیں، باقی میدانوں میں شبلی کے ہاتھوں سرانجام پانے والے کارناموں کا ذکر جانے دیجیے، صرف مورخ شبلی ہی کے کارناموں کی ایک طویل فہرست تیار کی جا سکتی ہے۔ المامون، النعمان، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم، اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر، بدء السلام اور سیرت النبی جیسی مستقل تاریخی تصانیف کے علاوہ مقالاتِ شبلی کے دو حصے بھی اُن کے تاریخی مقالات کے لیے مخصوص ہیں۔ ان کے علاوہ مقالات کی دوسری جلدوں میں بھی جا بجا شبلی کے تاریخی مقالات بکھرے پڑے ہیں۔ اس طویل فہرست اور شبلی کی تاریخ نویسی کے فن کا جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کیا تصانیف کی ضخامت، کیا کیفیت، کسی بھی اعتبار سے ان کا مرتبہ کم نہیں۔ وہ بلا شبہ ایک بڑے مورخ تھے، ایک ایسے بڑے مورخ جنھوں نے کہیں بھی تاریخ نویسی کی فنی ضروریات اور مقتضیات کو نظر انداز نہیں کیا۔ اسی بات کو دیکھتے ہوئے مہدی افادی نے کہا ہے: "ہم میں صرف

۱۔ ایس۔ ایم۔ اکرام، موج کوثر، صفحہ ۲۵۹

۲۔ ایضاً

شبلی ایسا شخص ہے جو بہ لحاظِ جامعیت اور وسیع النظری ، مورخانہ تدقیق اور مذاقِ فن کی حیثیت سے آج یورپ کے بڑے بڑے مورخوں سے پہلو بہ پہلو ہو سکتا ہے[۱] ۔"

---

۱ - افادات مہدی ، صفحہ ۱۰۳

شبلی بحیثیت مورخ

حصہ دوم

"فنی اعتبار سے ایک دوسرے سے ہزار مختلف ہونے کے باوجود ، سوانح نگاری اور تاریخ نویسی کے فنون ، شبلی کے یہاں اتنے قریب آ جاتے ہیں کہ اُن کے باہم فاصلے ، فاصلے نہیں معلوم ہوتے۔"

اکبر نے ہندوؤں اور دوسرے غیر مسلموں کو اپنے قریب لانے کے لیے دین الٰہی کی شکل میں ایک سیاسی چال چلی تھی، اس کے پیش نظر رعایا کو ایک ہی بندھن میں باندھنے کا خیال تھا۔ وقت کے تقاضوں کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ اس کی ایک کامیاب چال تھی لیکن مذہبی لحاظ سے ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کو جتنی ٹھیس اس حکمت عملی سے پہنچی شاید ہی کسی اور چیز سے پہنچی ہو۔ جہانگیر اور شاہجہاں نے اکبر کے نقشِ قدم پر چلنے کے بجائے اس کی مذہبی حکمتِ عملی کو در خور اعتنا نہ سمجھا۔ لیکن وہ مسلمانوں کے اقتدار کی گرتی ہوئی دیوار کا سہارا نہ بن سکے۔ ان کے بعد اورنگ زیب نے مسلمانوں کے اقتدار کا سہارا بننے کی کوشش کرتے ہوئے غیر مسلموں سے غیر منصفانہ برتاؤ کیے بغیر مسلمانوں کو پھر آگے بڑھانے کی سعی کی لیکن صد افسوس اس اہم کام کو انجام دینے کے لیے اسے لائق جانشین نہ مل سکے۔

اورنگ زیب کے جانشین مسلمانوں کا سہارا بننے کے بجائے آپس کے جھگڑوں میں الجھ گئے۔ انھیں اسلام کے مفاد سے زیادہ اپنا مفاد عزیز تھا۔ دوسروں کے معاملات میں دخل اندازی ہمیشہ سے مغرب کا معمول رہا ہے۔ چنانچہ انگریزوں نے ان حالات میں ہندوستان کی سیاست میں مداخلت کو اپنا

بنیادی حق سمجھ کر اپنی حکمت عملی کا سارا منصوبہ اسی مقصد کو سامنے رکھ کر بنایا اور اس پر عمل درآمد شروع کیا۔ اس منصوبے کا عملی آغاز اس طرح ہوا کہ ۱۷۶۵ء میں مغل فرمانروا شاہ عالم نے انھیں بنگال اور بہار کے دیوانی حقوق دے کر ان کو سیاسی قوت بخشی۔ پلاسی کی جنگ کے بعد میر جعفر نے انھیں چوبیس پرگنے دے کر ان کی سلطنت کی باقاعدہ بنیاد رکھی۔ تھوڑا ملنے پر بہت پانے کی ہوس ہوئی اور انگریزوں نے آہستہ آہستہ اپنے علاقے سے باہر نکلنے کی کوششیں شروع کر دیں اور دھیرے دھیرے پاؤں پسارتے پسارتے وہ اقتدار کی اس منزل پر آ پہنچے کہ مغل شہنشاہ محض قلعہ دہلی کی چار دیواری تک محدود ہو کر رہ گیا۔ لیکن اس کے باوجود نام کی بادشاہت اب بھی مغلوں کے ہاتھ میں تھی البتہ ملکی قوانین انگریزوں کی مرضی سے بنتے تھے۔ "۱۸۱۸ء میں قانونِ بازیابی (Law of Resumption) بنایا گیا جس کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی کو رعایا سے وہ تمام زمین ہتھیا لینے کا حق حاصل ہو گیا جو مغل بادشاہوں نے انھیں بخش دی تھی اور جس پر حکومت کی طرف سے کوئی ٹیکس بھی عائد نہیں کیا گیا تھا۔ جس زمانے میں قانونِ بازیابی (Law of Resumption) منظور ہوا اس وقت بنگال کے ۹۵٪ زمیندار مسلمان تھے، اس قانون کے نافذ ہونے کے دس سال کے اندر اندر یہ حیثیت بالکل بدل گئی اور صرف ۵٪ مسلم زمیندار رہ گئے[1]۔"

1, In 1818 a Law, known as the Law of Resumption was promulgated through which the East India Company acquired the right to take over all rent free holdings

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

اس کے بعد ایک اور قانون کے ذریعے "۱۸۳۵ء میں فارسی زبان کے بجائے انگریزی زبان کو سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں رائج کر دیا گیا ۔ اس تبدیلی نے مسلمانوں کو ان کی تہذیبی زبان سے بھی محروم کر دیا[1] ۔"

کچھ عرصے تک تو انگریزوں کا طوطی بولتا رہا لیکن آخر کب تک ، ہر چیز کی انتہا ہوتی ہے ۔ مقامی ریاستوں میں انگریزوں کا عمل دخل بڑھتا دیکھ کر حکمران طبقے اور عوام کے دلوں میں ان کے خلاف اُبلتا ہوا لاوا پھٹ پڑا ، مختلف جگہوں پر ہونے والی سپاہیوں کی بغاوتوں نے اور شہہ دی ، نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں کے خلاف آگ پورے ملک میں بھڑک اٹھی ۔ لیکن مقامی حکمرانوں کی بد قسمتی کہ شکست کا طوق ان کے گلے میں پڑا اور انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت سنبھالی ۔ جنگِ آزادی میں ہندوؤں اور مسلمانوں ،

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

which the Mogul Kings had granted to their subjects. When the Law of Resumption was passed 95% Zamindars in Bengal were Muslims ; Within ten years of the enforcement of the said Law the position was reversed and only 5% Muslim Zamindars were left."

Jamil ud Din Ahmad, Early Phase of Muslim Political Movement P. 7.

1. "In 1835 the Persian language was banished from the Court and the offices and replaced by English. This change deprived the Muslim of their Cultural language."

Ibid P. 7

دونوں نے ہم آواز ہو کر انگریزوں کے خلاف نعرۂ آزادی بلند کیا تھا لیکن انھوں نے اس کا ذمہ دار سراسر مسلمانوں کو ٹھیرایا ، شاید اس لیے کہ ہندوستان کی حکومت انھوں نے مسلمانوں سے چھینی تھی - مسلمان برابر ان کے مظالم کا نشانہ بنتے رہے ان پر لا انتہا ظلم ڈھائے گئے - ملازمتوں کے دروازے ان پر بند کیے گئے ، سیکڑوں مسلم خاندانوں کو گولی سے اڑا دیا گیا لیکن ہندوؤں پر کوئی آنچ نہ آئی ، ان ہنگاموں کو بقول سرسید "ہندوؤں نے شروع کیا ، مسلمان دل جلے تھے ، وہ بیچ میں کود پڑے ، ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے ، مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ و برباد ہو گئے[۱] -" اس زمانے میں دہلی کے مسلمانوں پر جو ستم ڈھائے گئے ان کی داستان غالب کی زبانی سنیے ، باقی شہروں میں مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کی داستان بھی کچھ اس سے مختلف نہ تھی :

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

مسلمان ان مظالم کا نشانہ بن رہے تھے اور ذکی الحس سرسید کو یہ فکر تھی کہ وہ اپنے ہم مذہبوں کو اس مصیبت سے کیسے

۱- مکتوب سرسید بنام بدر الدین طیب جی، مکاتیب سرسید ، صفحہ ۲۷۳

بچائیں، ظلم و ستم سے مسلمانوں کے چھٹکارے کی انھیں صرف یہی صورت نظر آئی کہ انھیں جدید تعلیم سے روشناس کرایا جائے۔ اسی خیال کو سامنے رکھ کر انھوں نے ایک ایسی تحریک کا آغاز کیا جسے بعض لوگوں نے خالص سیاسی ، بعض نے خالص علمی اور بعض نے ایک ملی جلی تحریک کہا ہے۔

سرسید کی اس تحریک کے دو پہلو تھے ، ایک یہ کہ کسی طرح انگریزوں اور مسلمانوں کو قریب لایا جائے اور دوسرا یہ کہ کسی طرح مسلمانوں کے دل سے اس احساس کمتری کو دور کیا جائے جو ان میں جنگ آزادی میں شکست کھانے کے بعد پیدا ہوگیا تھا اور جس کی وجہ سے وہ انگریزوں کو ہر قسم کے جدید علوم کا منبع اور سرچشمہ سمجھنے لگے تھے۔ پہلا کام سرسید نے خود کیا اور دوسرے کام کی باگ ڈور شبلی نے سنبھالی۔

ایک طرف سرسید نے تبین الکلام[1] لکھ کر مسلمانوں اور عیسائیوں کے مذاہب کی بنیادی مطابقت دکھا کر دونوں کو قریب لانے کی سعی کی تو دوسری طرف شبلی نے بزرگانِ دین کی سوانح لکھ کر مسلمانوں کو اس غلامانہ ذہنیت سے بچانے کی کوششیں شروع کر دیں، جو جنگِ آزادی میں شکست کھانے سے ان میں پیدا ہو گئی تھیں ، شبلی نے اپنی سوانحی تصنیفات سے مسلمانوں کے دل میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی کہ ہم ان لوگوں کی اولاد سے ہیں جن کے آگے عیسائی تو عیسائی بڑے بڑے لوگوں نے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔

شبلی کٹر قسم کے مذہبی آدمی تھے ، ان کا عقیدہ تھا

---

۱ - انجیل کی تفسیر -

"دوسری قوموں کی ترقی یہ ہے کہ آگے بڑھتے جائیں، آگے بڑھتے جائیں لیکن مسلمانوں کی ترقی یہ ہے کہ وہ پیچھے ہٹتے جائیں، پیچھے ہٹتے جائیں یہاں تک کہ صحابہ کی صف میں مل جائیں[1]۔"

اسی عقیدے کو اساس بنا کر شبلی نے سوانح نویسی یا یوں کہہ لیجیے کہ تاریخ نویسی کا آغاز کیا۔ سوانح نویسی کے سلسلے میں وہ کارلائل کے اس نظریے کے حامی تھے کہ "تاریخ غیر معمولی شخصیتوں اور ناموروں کے غیر مختتم سلسلے کا نام ہے[2]۔" کارلائل کی طرح اُن کا بھی یہی خیال تھا کہ تاریخ کی تشکیل در اصل ناموران قوم ہی کے ہاتھوں ہوتی ہے۔ کارلائل سے اپنے اس فکری تعلق کا اظہار اُنھوں نے ایک جگہ یوں کیا ہے "کارلائل پڑھ رہا ہوں، وہ میرے کام کی چیز ہے[3]۔" اُن کا سلسلۂ ناموران اسلام اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ "ناموروں" اور "ہیروز" کی تاریخ ایک پورے عہد اور زمانے کی تاریخ کی ترجمانی کر سکتی ہے[4]۔"

یہاں شبلی کے کارلائل کے ایک نظریے سے متاثر ہونے کا ذکر ہوا ہے جس سے شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ یورپی

---

۱ - حیات شبلی صفحہ ۲۹۰

۲ - ایضاً صفحہ ۳۷۷

۳ - خط نمبر ۱۰۱ بنام حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مکاتیب شبلی جلد اول صفحہ ۲۰۰

4 - "The History of the World is but the Biography of great men"
Thomas Carlyle, Heroes, Hero Worship and Heroic in History, Page 27

مورخین سے متاثر تھے لیکن اس شبہے کا حقیقت سے کوئی تعلق قائم نہیں کیا جا سکتا ۔ چھوٹی موٹی باتوں میں یورپی مورخین کی خوبیوں سے فائدہ اٹھا لینا اس بات کی دلیل ہرگز نہیں بن سکتا کہ شبلی یورپی مورخین کے مقلد، معتقد یا پیرو تھے ۔ انھیں علم سے پیار تھا اور وہ برابر اس جستجو میں رہتے تھے کہ علم، جہاں سے بھی ملے اسے حاصل کیا جائے ۔ چنانچہ یورپ کے عالم اور مورخ تو ایک طرف رہے وہ اپنے چھوٹوں اور دوستوں کی معلومات سے فائدہ اٹھانے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ اس بات کے بے شمار ثبوت مل جائیں گے ، یہاں فی الحال صرف دو واقعات ملاحظہ فرمائیے ۔

علم الکلام کی تصنیف کے دوران میں انھیں چند معلومات کی ضرورت محسوس ہوئی تو شبلی نے بلا جھجک اپنے دوست مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کو لکھا :

"ایک بڑا ضروری امر یہ ہے کہ میں علم الکلام کا خاص حصہ لکھ رہا ہوں ۔ آپ کے پاس بھیجوں گا ۔ آپ دیکھ کر بتائیے گا کون سا حصہ رکھنے کے قابل ہے کون سا نہیں ۔ لیکن اس وقت دریافت طلب امر یہ ہے کہ عقائد کے مسائل ہیں کیا ؟ توحید لکھ چکا ہوں ۔ نبوت لکھ رہا ہوں ۔ اس کے بعد صرف معاد رہ جاتا ہے ۔ باقی کیا لکھوں ؟ کتب کلام میں جو عقائد لکھے ہیں وہ درحقیقت عقائد میں داخل نہیں مثلاً حدوث عالم ۔ صفات باری کا لاعین لاغیر ہونا وغیرہ وغیرہ ۔ اس لیے درخواست ہے کہ آپ کے نزدیک جو مسائل عقائد ضروری البحث ہوں ۔ ان کے عنوان لکھ

بھیجیے[1] -"

اسی طرح ایک اور خط میں مولانا حمیدالدین کو لکھتے ہیں : ''اب سیرت ابتدا سے اس طرح لکھ رہا ہوں کہ مکمل ہوتی جاتی ہے اور ساتھ ہی مطبع میں دے دی جاتی ہے لیکن اس ترتیب میں بعض جگہ رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور بعض مباحث ایسے پیدا ہو جاتے ہیں کہ تم سے استفسار اور تحقیق کی ضرورت پیش آتی ہے - اس وقت دو یا تین باتیں تحقیق طلب ہیں -

۱ - توراۃ میں یہ تصریح موجود ہے کہ حضرت اسمٰعیل بیر سبع یا فاران میں آباد ہوئے -

کتاب پیدائش باب ۲۵ درس ۱۸ میں یہ الفاظ ہیں -

"اور وہ حویلہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راہ میں ہے - جس سے اسور کو جاتے ہیں بسے تھے - ان کا قطعۂ زمین ان کے سب بھائیوں کے سامنے پڑا تھا[2] -"

ان عبارتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسمٰعیل وہاجرہ عرب میں نہیں آئے - اس سے متعلق تمھاری کیا تحقیق ہے اور کیا توراۃ سے بالکل قطع نظر کر لینی چاہیے[3] -"

ان خطوط سے یہ نتیجہ نکالنا قطعاً صحیح نہیں کہ شبلی مولانا شروانی یا مولوی حمید الدین کے پیرو یا مقلد تھے - کیونکہ کسی سے استفسار کرنا اس بات کی دلیل ہرگز نہیں

---

۱ - خط نمبر ۳۷ بنام مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مکاتیب شبلی حصہ اول ، صفحہ ۱۴۹

۲ - خط نمبر ۵۹ بنام حمید الدین صاحب بی - اے ، مکاتیب شبلی جلد دوم ، صفحہ ۳۹-۴۰

۳ - ایضاً

ہے کہ پوچھنے والا جواب دینے والے کا پیرو یا مقلد ہی ہو۔ شبلی کا یہ طرز عمل ان کے طالب علمانہ مزاج کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کے بغیر مورخ کا صحیح معنوں میں مورخ بننا ممکن نہیں۔

جن بہت سے علما اور ادبا نے شبلی کو یورپ کا مقلد اور پیرو قرار دینے کی کوشش کی ہے اُن میں ایک نام بزرگ محترم ڈاکٹر سید عبداللہ کا بھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک مضمون ''شبلی کا نظریۂ تاریخ[1]'' میں شبلی کو یورپ کا مقلد و معتقد ٹھیراتے ہوئے اپنی بات ثابت کرنے کے لیے شبلی ہی کا ایک جملہ نقل کیا ہے، وہ جملہ ہے ''یورپین مورخوں کی تصنیفات کشتِ زعفران نظر آتی ہیں[2]۔''، ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی کو سید صاحب کے اس خیال سے قطعی اختلاف ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر سید عبداللہ کے اس بیان کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے: ''شبلی کے اس جملہ کو جو در حقیقت یورپین مورخیں کی ''ہجو ملیح'' ہے مدح سمجھنا مضحکہ خیز ہے[3]۔'' آفتاب صاحب کا کہنا ہے: ''مشہور ہے کہ کشتِ زعفران کو دیکھنے سے بے ساختہ ہنسی آتی ہے۔ شبلی کا مطلب یہ ہے کہ یورپین مورخوں کی تصانیف میں اس قدر تمسخر آمیز معلومات درج ہوتی ہیں کہ ان کو دیکھ کر انسان بے اختیار ہنس پڑتا ہے[4]۔'' کشت زعفران سے جو مطلب آفتاب صاحب نے اخذ کیا ہے یقیناً وہی مطلب شبلی کے پیش نظر بھی تھا۔

---

۱ - مطبوعہ معارف، اعظم گڑھ مارچ، اپریل ۱۹۳۸ء

۲ - معارف، اعظم گڑھ، اپریل ۱۹۳۸ء، صفحہ ۲۸۲

۳ - آفتاب احمد صدیقی، شبلی ایک دبستان، صفحہ ۸۶

۴ - ایضاً

یہ بات زیرِ بحث خط کے اس سے اگلے جملے سے واضح ہو جاتی ہے جس کی طرف معلوم نہیں کیوں ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی دونوں نے توجہ نہیں فرمائی ۔ اگلا جملہ ہے : ”سیکڑوں ہوائی قلعے بنائے ہیں ۔“ دونوں جملے ملا کر پڑھیے شبلی کا مطلب سمجھ میں آ جاتا ہے ۔ کہتے ہیں ”یورپین مورخوں کی تصنیفات کشتِ زعفران نظر آتی ہیں سیکڑوں ہوائی قلعے بنائے ہیں[۱] ۔“

اس خط کا ذکر ایک طرف رہنے دیجیے اس کے علاوہ اور بھی کئی خطوط میں شبلی وقتاً فوقتاً یورپی مورخین کے بارے میں اظہار خیال کرتے رہے ہیں ، جنھیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یورپی مورخین کے بارے میں اُن کے خیالات اس قدر خراب تھے کہ ان کے یورپی مورخوں سے متاثر ہونے کا سوال تو ایک طرف رہا وہ انھیں منہ لگانے کے بھی روا دار نہ تھے ۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ۔

سیرت النبی کے متعلق مواد جمع کرتے ہوئے شبلی نے ۵ فروری ۱۹۱۳ع کو جو خط مولانا سلیمان ندوی کو لکھا اس کا یہ ٹکڑا بڑا معنی خیز ہے : ”انگریزی معلومات کو دیکھ لیا ، سب گودڑ ہے ، ان کے ترجمہ پر وقت اور روپیہ ضائع کرنا بے فائدہ ہے[۲] ۔“

یہ اقتباس شبلی کے ایسے خط سے لیا گیا ہے جو ان کے

---

۱ ۔ خط نمبر ۱۰۱ بنام حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مکاتیب شبلی جلد اول، صفحہ ۱۹۹

۲ ۔ خط نمبر ۱۴ بنام سلیمان ندوی ، مکاتیب شبلی جلد دوم ، صفحہ ۸۳

انتقال سے تقریباً ایک سال پیشتر لکھا گیا - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آخر عمر تک انگریز یا دوسرے لفظوں میں یورپی مورخین کے بارے میں ان کے خیالات کیا تھے - اسی سال ۱۸ مارچ کو ایک خط میں انھوں نے لکھا : "یورپ کے خیالات کا بڑا حصہ سامنے آ گیا ، سب تاروں کی ایک ہی صدا ہے ، کچھ غلط فہمیاں ، کچھ نا واقفیت ، کچھ تعصب ، باقی ہیچ[1] -" یہ خیالات بھی شبلی کی اس عمر کے ہیں جب انسان ہر بات کو اپنے تجربے کی ترازو میں تول کر دیکھتا ہے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یورپی مورخوں کے بارے میں شبلی کے یہ خیالات آن کی تمام عمر کے تجربے اور تجزیے کا نچوڑ ہیں - ایک اور خط کے دو جملے ملاحظہ فرمائیے ، لکھتے ہیں : "یورپین مورخوں پر روز بروز حیرت بڑھتی جاتی ہے ... عجیب عجیب قیاس آفرینیاں نظر آتی ہیں[2] -"

ان خطوط کی روشنی میں یورپی مورخوں کے بارے میں شبلی کے خیالات کو بڑی صفائی سے پڑھا جا سکتا ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود یقیناً اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شبلی نے یورپی مورخوں کے مقلد اور معتقد نہ ہونے کے باوجود ان سے استفادہ ضرور کیا ہے - یہ الگ بات ہے کہ فائدہ اٹھانے کی یہ صورت مثبت کے بجائے منفی ہو -

کسی نے حکیم لقمان سے پوچھا تھا - "تم نے عقل و فہم کس سے پائی؟"

---

۱ - خط نمبر ۲۱ بنام مولوی ریاض حسن ، مکاتیب شبلی جلد دوم ، صفحہ ۱۹۲

۲ - خط نمبر ۵۷ بنام مولانا حمید الدین بی اے مکاتیب شبلی جلد دوم ؛ صفحہ ۲۸

جواب ملا : ''بیوقوفوں سے ۔"
سوال کرنے والے نے پھر پوچھا : ''وہ کیسے ؟"
لقمان نے جواب دیا : ''یوں کہ جو وہ کرتے ہیں میں نہیں کرتا ۔"

یہی حال شبلی کا ہے ، صحیح معنوں میں وہ یورپی مورخوں کے نہ مقلد ہیں نہ معتقد ، لیکن منفی طور پر انھوں نے ان سے فائدہ ضرور اُٹھایا ہے وہ یوں کہ یورپی مورخین نے مسلمان رہنماؤں کے خلاف جو زہر اگلا، اس کا تریاق مہیا کرنے کے لیے شبلی نے قلم سنبھالا ، اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ نویسی کے میدان کی طرف اُن کی رہنمائی یورپی مورخوں ہی نے کی ۔ اس میدان میں شبلی نے ایک منجھے ہوئے کھلاڑی کی طرح کھیلنا شروع کیا اور جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا ، اس پہ لکھنے میں اتنی جانفشانی سے کام لیا کہ ''جہاں تک اپنے موضوع کا تعلق ہے اوروں کے مقابلے میں انھوں نے ہمیشہ بلند معیار پیش کیا [۱] ۔"

ان کی تصانیف کے تحقیق و تدقیق کے بلند معیار کا اعتراف جہاں ہندوستان میں ہوا وہاں بیرونی دنیا کے صاحبِ نظر بھی انھیں سراہنے اور ان سے فائدہ اٹھانے پر مجبور ہوئے ۔ مصر کے عیسائی مورخ جرجی زیدان نے ''تمدن اسلامی" کے نام سے جب چار پانچ جلدوں میں اسلامی تمدن کی تاریخ لکھی تو اس تاریخ کی تیسری جلد جو اسلامی علوم و فنون پر ہے مولانا شبلی کے رسائل سامنے رکھ کر اور "ان ہی کو دیکھ کر

---

۱ ۔ ڈاکٹر شاہ علی ، حالی اور شبلی سوانح نگار کی حیثیت سے ، نگار ، لکھنؤ ، اگست ۱۹۵۶ع ، صفحہ ۷۰

اسی رنگ سے (واقعات کے حوالوں کی مدد سے جو رسائل کے حاشیوں پر لکھے ہوئے تھے) تیار کی[1] ۔"

شبلی نے کسی عہد یا زمانے کی کوئی باقاعدہ تاریخ نہیں لکھی، ضرورت کے تحت کبھی کبھی مختلف موقعوں پر وہ تاریخی موضوعات پر مضامین البتہ لکھتے رہے ۔ جن کا ذکر ہم پچھلے باب میں کر آئے ہیں ۔ ان مضامین کے ہوتے ہوئے شبلی اگر کوئی اور تصنیفی کام نہ بھی کرتے تب بھی انھیں اردو میں تاریخ کا معلم اول ہی سمجھا جاتا ۔ لیکن انھوں نے ان مضامین کے علاوہ کئی سوانح عمریاں بھی اپنی یادگار چھوڑی ہیں جنھوں نے مورخ کی حیثیت سے اُن کے مقام کو مزید بلند اور ممتاز بنا دیا ہے ۔

فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو سوانح نگاری اور تاریخ نویسی کے فنون کسی حال میں بھی ایک دوسرے سے لگا نہیں کھاتے لیکن شبلی کے یہاں سوانح نگاری اور تاریخ نویسی میں فاصلے زیادہ نہیں رہتے ، وہ بنیادی طور پر مورخ تھے اس لیے ان کا ہر فعل مورخ کی حیثیت سے اور ہر کام مورخ کے روپ میں ہوتا تھا ۔ اسی بات کو دیکھتے ہوئے کسی نے کہا ہے ''وہ تاریخ کے بغیر لقمہ نہیں توڑ سکتے تھے ۔" اس بیان کا تحقیقی نظر سے جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پوری طرح نہیں تو کسی حد تک اس میں صداقت ضرور ہے ۔ شبلی کی یہ عادت ہے کہ وہ خواہ ادبی و علمی موضوع پر لکھ رہے ہوں ، خواہ کسی اور موضوع پر ، اپنی بات کا رشتہ تاریخ سے ضرور ملادیتے ہیں۔ اس بات کے شاہد شعرالعجم میں دیے جانے والے شاعروں کے

---

۱ - حیات شبلی ، صفحہ ۲۳۰

طول طویل حالاتِ زندگی اور موازنۂ انیس و دبیر کے بعض حصے بھی ہیں جہاں تاریخی واقعات کے بیان کی ضرورت نہ ہونے کے باوجود شبلی نے صفحے کے صفحے اپنے اس شوق کی تکمیل کے لیے وقف کر دیئے ہیں۔ انھوں نے ایک جگہ اس بات کو خود بھی تسلیم کیا ہے کہ تاریخ ان کا اوڑھنا بچھونا ہے جس کے سہارے کے بغیر وہ ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔ بقول سلیمان ندوی وہ کہا کرتے تھے: ''تاریخ تو ہمارے دسترخوان کی چٹنی ہے، ہم جو چیز کھانا چاہتے ہیں، اس کو اس ذریعے سے مرغوب بناتے ہیں[1]۔''

یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ، صاحبِ سوانح کے حالات سے زیادہ زمانے کی تاریخ کو اہمیت دیتے ہیں، سوانح نگاری کرتے ہوئے بھی اُن کے ذہن میں ہمیشہ تاریخ کا خیال منڈلاتا رہتا ہے جس کا اعتراف دیدہ و دانستہ یا غیر ارادی طور پر بعض جگہ انھوں نے خود بھی کیا ہے۔ مثلاً سوانح لکھتے وقت وہ کبھی اپنی تصنیف کا ذکر کرتے بھی ہیں تو ''ہماری سوانح'' نہیں کہتے بلکہ ''ہماری تاریخ'' ہی کہہ کر اُس کا ذکر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ فرمائیے المامون کا دوسرا حصہ جسے انھوں نے یوں شروع کیا ہے: ''ہماری تاریخ کا پہلا حصہ گو نہایت معتمد اور مستند تاریخوں سے ماخوذ ہے اور اس اعتبار سے وہ ان تمام تاریخوں کا ایسا جامع انتخاب ہے جس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا تاہم وہ مامون کے عہد سلطنت کی یک رخی تصویر ہے[2]۔'' اسی طرح انھوں نے اپنی لکھی ہوئی سوانح عمریوں

---

۱ - مولانا غلام محمد، شبلی سلیمانی نگاہ میں، شبلی نمبر، ادیب، علی گڑھ ستمبر ۱۹۶۰، صفحہ ۹۶

۲ - المامون، صفحہ ۹۶

میں ہمیشہ تاریخ نویسی کے اصولوں سے بحث کی ہے فن سوانح نگاری کا ذکر تک نہیں کیا اس بات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سوانح لکھتے میں بھی ہمیشہ ان کے پیش نظر تاریخ ہی ہوتی ہے -

سوانح نگاری اور تاریخ نویسی کے فنون کا سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ سوانح نگار کا کھینچا ہوا مرقع مصور کی بنائی ہوئی تصویر کی مانند ہوتا ہے جو تصویر بناتے وقت صرف ان چیزوں کا انتخاب کر لیتا ہے جو اس کی نظر میں پسندیدہ ہوتی ہیں ، دوسری طرف ایک غیر جانبدار مورخ کا قلم ایسی تصویر بناتا ہے جو کیمرے کی کھینچی ہوئی تصویر کی طرح ہوتی ہے ، جس میں ہر اچھی بری چیز اس طرح سامنے آ جاتی ہے جیسی وہ حقیقت میں ہے -

شبلی کی سوانح عمریاں دوسری قسم کی ہیں اس لیے انھیں سوانح عمریوں کے بجائے تاریخی تصانیف قرار دینا زیادہ مناسب ہے - ایک اور بات یہ کہ[1] شبلی سوانح لکھتے وقت ایک وکیل کی طرح جانبداری سے اپنے موکل کا مقدمہ پیش نہیں کرتے بلکہ وہ ایک غیر جانبدار منصف کی طرح دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ الگ کر دیتے ہیں اور کوئی لگی لپٹی بات کہنے کے بجائے صاف صاف اپنے دل کی بات کہہ دیتے ہیں ، وہ سوانح لکھتے وقت خاص طور پر یہ کوشش کرتے ہیں کہ ہر بات غیر جانبداری سے کہی جائے - یہ بات بھی اُن کے سوانح نگار سے زیادہ مورخ ہونے کی دلیل ہے -

---

۱ - وہ سچائی اور غیر جانبداری کو اپنا دین اور مذہب سمجھتے تھے ، انھیں ہر شے سے غیر جانبداری زیادہ عزیز تھی چنانچہ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

اس کے علاوہ سوانح نگار زمانے سے زیادہ انسان کو اہمیت دیتا ہے اور مورخ انسان سے زیادہ زمانے سے دلچسپی رکھتا ہے۔ سوانح نگار زمانے سے اتنی ہی بحث کرتا ہے جتنی کہ ایک فرد کی تصویر کے لیے ضروری ہے۔ مورخ افراد کی بحث میں صرف اس حد تک الجھتا ہے جس حد تک زمانے کی تاریخ اسے اجازت دیتی ہے۔ سوانح نگار کا ذہن دائرے سے مرکز کی طرف رجوع کرتا ہے اور مورخ کا ذہن مرکز سے دائرے کی طرف پھیلتا ہے، شبلی اس نقطۂ نظر سے "بھی" ہمیں مورخ معلوم ہوتے ہیں۔" انھوں نے خود بھی الماموں کے دیباچے میں اس کی وضاحت کر دی ہے کہ وہ اپنی تصانیف میں سوانح اور تاریخ دونوں کو ایک ہی حیثیت دیتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ "میں نے کوشش کی ہے کہ "لائف" میں بھی تاریخ کا مذاق قائم رہے۔" لیکن اسے کیا کیا جائے کہ وہ اپنی اس کوشش میں اکثر و بیشتر صرف تاریخ کے ہو کر رہ گئے ہیں۔

شبلی کی اس وضاحت اور فن کی ترازو میں ان کی سوانحی

پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ

ایک مرتبہ حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے صحابہ کرام کا حال لکھنے کا ارادہ کیا تو مولانا نے انھیں لکھا۔ "صحابہ کے حالات سے بڑھ کر کوئی چیز ہمارے لیے نمونہ نہیں بن سکتی، لیکن ہر پہلو کو لیجیے اور ان پہلوؤں کو صاف دکھائیے جن سے آج کل کے مولوی قصداً چشم پوشی کرتے ہیں خط نمبر ۱۶ بنام حبیب الرحمٰن خاں شروانی مکاتیب شبلی حصہ اول صفحہ ۹۱

۱۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ صفحہ ۱۲۸

۲۔ دیباچہ الماموں صفحہ ۴

تصانیف کو تولنے کے بعد یقیناً اب اس بات کی گنجائش نہیں رہتی کہ اُن کی سوانحی تصانیف کو تاریخی تصانیف نہ سمجھا جائے۔

ہندوستان کی حکومت سنبھالتے ہی انگریزوں نے ہندوستانی عوام کو اپنی عظمت کے قصے سنا کر مرعوب کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ جس کے نتیجے میں یہاں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ قابلیت، علمیت، لیاقت اور واقعیت کا سرچشمہ اور منبع صرف اور صرف یورپ ہی کو سمجھنے لگا تھا۔ دوسری طرف انگریزوں نے ہندوستان کے تخت پر براجمان ہوتے ہی اس بات کو بھی اپنا فرض بنا لیا تھا کہ جیسے بھی ہو مسلمانوں کی تاریخ کو یوں مسخ کیا جائے کہ وہ گردن اٹھا کر دیکھنے کے قابل نہ رہیں۔ انھیں اپنے آبا و اجداد اور اپنے اسلاف سے اتنی نفرت ہو جائے کہ وہ ان کا نام اپنے نام کے ساتھ لیتے ہوئے شرمائیں۔ اس بات کو خود شبلی نے یوں بیان کیا ہے: ”یورپ کے بے درد واقعہ نگاروں نے سلاطینِ اسلام کی غفلت شعاری، عیش پرستی اور سیہ کاری کے واقعات کو اس بلند آہنگی سے تمام عالم میں مشہور کیا ہے کہ خود ہمیں کو یقین آ چلا اور تقلید پرست تو بالکل یورپ کے ہم آہنگ بن گئے[۱]۔“

اس غلامانہ ذہنیت اور احساس کمتری سے نجات دلانے کے لیے ضروری تھا کہ اسلامی تاریخ کے ایسے ذریں اوراق الٹ کر دکھائے جاتے جن سے مسلمانوں کے دل میں یہ احساس پیدا ہوتا کہ ہم ایک ایسے دین سے تعلق رکھتے ہیں جس کی عظمت، بلندی اور بڑائی کے آگے بڑی بڑی قومیں بھی پست

۱۔ مقالات شبلی جلد چہارم، صفحہ ۸۲

اور پیچ نظر آتی ہیں ۔ سرسید کی اصلاحی تحریک کے بنیادی مقاصد میں سے ایک مقصد جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کے دلوں سے اس احساسِ کمتری کو دور کیا جائے جو جنگ آزادی میں شکست اور ناکامی کے بعد ان کے دلوں میں پیدا ہو گیا تھا ۔ یہ عظیم کام سرسید نے شبلی کو سونپا ۔ "شروع شروع میں مولانا کا ارادہ ایک مکمل اسلامی تاریخ لکھنے کا تھا[1] ۔" لیکن یہ کام اتنے پھیلاؤ کا تھا کہ اسے پورا کرنا ایک فرد کے بس کی بات نہ تھی ۔ "چنانچہ پوری اسلامی تاریخ لکھنے کا خیال چھوڑ کر انھوں نے "رائل ہیروز آف اسلام" (یعنی نامور فرمانروایان اسلام) کا سلسلہ لکھنے کا فیصلہ کیا[2] ۔" اس سلسلے میں انھوں نے "وہ نامور منتخب کر لیے جو اپنے طبقے میں عظمتِ حکومت کے اعتبار سے اپنا ہم سر نہ رکھتے تھے[3] ۔" اور اپنے کام کا آغاز کیا ۔

المامون :

اس سلسلے کی پہلی تصنیف المامون تھی جو ۱۸۸۹ع میں شائع ہوئی ۔ یہ زمانہ شبلی کے علی گڑھ میں قیام کا ہے یہی وجہ ہے کہ اس تصنیف کے پیچھے کبھی کبھی سرسید آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے نظر آ جاتے ہیں ۔

شبلی کی دوسری سوانحی تصانیف کی طرح المامون بھی صرف ایک فرد یا ایک شخص کی داستانِ حیات نہیں بلکہ مامون الرشید کے عہدِ حکومت کی پوری تاریخ ہے ۔

---

۱ ۔ المامون صفحہ ۲

۲ ۔ ایضاً

۳ ۔ ایضاً

مامون الرشید سے شبلی کو جتنی محبت اور عقیدت ہے اس کے مظہر ان کے یہ الفاظ ہیں : "اسلام کو آج تیرہ سو برس سے کچھ اوپر ہوئے ، اس وسیع مدت میں ایک تخت نشین بھی ایسا نہیں گزرا جو فضل و کمال کے اعتبار سے مامون کی شانِ یکتائی کا حریف ہو سکتا ۔ افسوس ہے کہ سلطنت کے انتساب نے اس کو خلفا و سلاطین کے پہلو میں جگہ دی ورنہ شاعری ، ایام العرب ، ادب ، فقہ ، فلسفہ ، کونسی بزم ہے جہاں فخر و شرف کے ساتھ اُس کا استقبال نہ کیا جاتا" ۔[۱]

شبلی کو مامون سے جتنی عقیدت ہے اور وہ اس کے جس شدت سے مداح اور شیدائی ہیں اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ دولتِ عباسیہ کا ہیرو انھوں نے ہارون کے بجائے مامون کو قرار دیا ہے ۔ وہ مامون کے مداح اور شیدائی ضرور ہیں لیکن مامون سے محبت، عقیدت اور شیفتگی کے باوجود ان کی طبیعت یہ گوارا نہیں کرتی کہ وہ ہر دم اس کے نام کی تسبیح پڑھتے رہیں چنانچہ کہیں کہیں وہ مامون الرشید کی سوانح لکھتے لکھتے صاحبِ سوانح کو اس طرح بھول جاتے ہیں جیسے وہ اس کی بابت کچھ نہ لکھ رہے ہوں بلکہ کسی اور کی زندگی کے حالات قلمبند کر رہے ہوں ۔ خاص طور پر امین کے ذکر کے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ مامون کے بجائے اسی کی سوانح ہو ۔ اس کے قتل کا حال شبلی نے نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے ، اور کچھ اس انداز سے کہ اسے پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انھیں امین کے قتل سے بے حد دکھ پہنچا ہو ۔ اُس کے قتل کے ذکر میں لکھتے ہیں: "امین گو عیش پرست اور نازک اندام تھا مگر اس کے ساتھ نہایت شجاع

---

۱ ۔ المامون ، صفحہ ۱۲۵

اور قوی بھی تھا ۔ بے کسی میں بھی قاتلوں کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ آگے بڑھیں ، ہر شخص دوسرے پر لٹالتا تھا ۔ امین نے بجائے سلاح جنگ کے ہاتھ میں ایک تکیہ اٹھا لیا اور یہ کہتا تھا کہ میں تمہارے نبی کا ابن عم ہوں ، ہارون الرشید کا فرزند ہوں ، مامون کا بھائی ہوں ، میرا خون کسی طرح حلال نہیں ۔" بالآخر ایک شخص تلوار لے کر بڑھا اور امین کے سر پر ماری ۔ ایسی گستاخی اور جرأت نے امین کو یقین دلایا کہ اس کی درد ناک فریاد ان سنگدلوں پر کچھ اثر نہیں کر سکتی ، وہ مرنے کے لیے تیار ہوا مگر ایسا ہی مرنا جیسا ایک عباسی شہزادے کو درکار تھا ۔ اب اس کی نزاکت، غضب ناک جرأت میں بدل گئی، دلیرانا بڑھا اور چونکہ تنہا تھا ، چاہا کہ حریف کی تلوار چھین کر ہاشمی جرأت کے جوہر دکھائے ۔ یہ دیکھ کر گروہ کا گروہ اس پر ٹوٹ پڑا ۔ ایک شخص نے کمر پر تلوار ماری ، پھر سب نے مل کر پچھاڑا اور الٹی طرف سے ذبح کیا'۔"

شبلی اس بات کے قائل ہیں کہ مورخ کو ہمیشہ غیر جانبداری سے کام لینا چاہیے چنانچہ مامون سے عقیدت کے باوجود انھوں نے مامون کے بے موقع گن کبھی نہیں گائے بلکہ بعض موقعوں پر تو یوں اظہار خیال کیا ہے کہ مامون کی عظمت کا نقش بہت ہلکا ہو جاتا ہے اور اس کے دشمنوں سے محبت کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے ۔

ایک جگہ امین کی والدہ اور مامون کی سوتیلی ماں زبیدہ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "جب امین کی فوج کا سپہ سالار علی بن عیسٰی مامون کو گرفتار کرنے جانے لگا تو

---

۱ - المامون ، صفحہ ۹۵

اسے ''زبیدہ نے چاندی کی ایک زنجیر منگا کر دی کہ مامون گرفتار ہو تو اس میں مقید کر کے لانا ۔ اس کے ساتھ یہ نصیحتیں کیں کہ امین اگرچہ میرا لختِ جگر ہے تاہم مامون کا بھی مجھ پر حق ہے ، تم جانتے ہو وہ کس کا بیٹا اور کس کا بھائی ہے ، گرفتار ہو تو پاسِ ادب ملحوظ رکھنا ، سخت کہے تو برداشت کرنا ، راہ میں رکاب تھام کر چلنا ، کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے[۱] ۔''

اسی طرح ایک جگہ لکھتے ہیں : ''امین نے اپنے نمک خوار غلام احمد بن سلام سے پوچھا : ''مامون کا کچھ حال معلوم ہے ؟'' اس نے کہا : ''زندہ ہے ۔'' امین کہنے لگا : ''خدا پرچہ نویسوں کا برا کرے ، کم بختوں نے خبر دی تھی کہ مر گیا[۲] ۔''

دوسری طرف جب مامون کی خدمت میں امین کا کٹا ہوا سر پیش کیا گیا تو بقول شبلی : ''اس نے اپنے بھائی کے خون آلود سر کو مسرت کی نگاہ سے دیکھا اور جوشِ خوشی میں سجدۂ شکر ادا کیا[۳] ۔''

ان واقعات کو پڑھ کر امین کی عظمت کے آگے مامون الرشید ہیچ دکھائی دینے لگتا ہے ۔ اگر کوئی جانبدار مورخ ہوتا تو ان واقعات کے ذکر کے بجائے انھیں کلیتاً غائب کر جاتا یا ان میں ایسی تاویلیں کرتا کہ یہی واقعات مامون کی گراوٹ کے بجائے اس کی عظمت کی منہ بولتی تصویر بن جاتے ، لیکن شبلی کے غیر جانبدار قلم سے ایسی توقع ناممکن تھی ۔ انھوں نے

---

۱ ۔ المامون ، صفحہ ۴۲

۲ ۔ ایضاً صفحہ ۴۵

۳ ۔ ایضاً صفحہ ۴۶

جھوٹ بولنے پر ہمیشہ سچائی کو ترجیح دی کہ اسے تاریخ نویسی کے فن کے لیے جزوِ لازم کی حیثیت حاصل ہے -

شبلی کی تاریخ نویسی کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ کبھی بے مزگی یا بے کیفی میں مبتلا نہیں ہونے دیتے ، جا بجا وہ ایک قصہ گو کی طرح ایسے ایسے دلچسپ قصے سناتے جاتے ہیں کہ واقعات کا تسلسل بھی ختم نہیں ہوتا ، اس میں خشکی اور بے کیفی بھی نہیں رہتی اور قاری کی اکتاہٹ بھی دور ہو جاتی ہے - طوالت کے خوف سے یہاں صرف ایک قصہ ملاحظہ فرمائیے - شبلی رقم طراز ہیں :

''ایک دن علماء کا مجمع تھا، ہر فن کے اہلِ کمال دربار میں حاضر تھے ، ایک عورت فریادی آئی کہ میرا بھائی چھ سو اشرفیاں چھوڑ کر قضا کر گیا مگر لوگوں نے ترکہ میں مجھ کو ایک ہی اشرفی دلوائی - مامون نے ذرا دیر دل ہی میں کچھ حساب لگایا ، دیکھا تو سہام صحیح تھے ، عورت سے کہا : ''ہاں تجھ کو اتنا ہی ملنا چاہیے -'' اس غیر متوقع جواب پر سب کو حیرت ہوئی - علماء نے پوچھا : امیرالمومنین! کیوں کر؟ مامون نے کہا : ''متوفی کی دو بیٹیاں ہوں گی ، دو ثلث یعنی چار سو اشرفیاں تو ان کو ملیں ، ماں بھی ہو گی جس کو سدس یعنی سو اشرفیاں پہنچیں ، زوجہ کو ثمن یعنی پچھتر ملا ہو گا - ۲۵ باقی رہے - مامون نے عورت کی طرف مخاطب ہو کر کہا سچ کہنا تیرے بارہ بھائی ہیں ؟ عورت نے تسلیم کیا کہ ''ہاں'' - مامون نے کہا : ''دو دو ان کو ملیں ، ۲۴ ہوئیں ، ایک باقی رہی وہ تیرا حق ہے[1] -''

---

۱ - المامون ، صفحہ ۱۳۶

شبلی تاریخ اور تحقیق کو لازم و ملزوم جانتے ہیں ، ان کے نزدیک تاریخ نویسی کا تصور تحقیق کے بغیر نا ممکن ہے ۔ تحقیق کے لیے اُنھوں نے ہمیشہ دو وسائل اختیار کیے ہیں ۔ ایک روایت اور دوسرا درایت ، انھی دو اصولوں کی مدد سے وہ سچ اور جھوٹ کی پہچان کرتے ہیں ، المامون میں بھی ان کی گاڑی ان ہی دو اصولوں پر چلتی نظر آتی ہے ۔ ان کی برابر یہ کوشش ہوتی ہے کہ جو واقعہ بھی بیان کریں وہ ایسے شخص کی زبانی ہو جو واقعہ کا عینی شاہد ہو یا جس کا بیان ہونے والے واقعے سے کوئی قریبی تعلق ہو ، المامون لکھتے میں بھی اُن کی یہی جستجو رہی ہے ، امین کے قتل کا واقعہ بھی جس کا ذکر اس سے بیشتر کسی قدر تفصیل سے ہو چکا ہے انھوں نے امین کے غلام احمد بن سلام کی زبانی بیان کیا ہے جو واقعے کے وقت موجود تھا ۔ اسی طرح المامون کے صفحہ ۱۰۲ پر انھوں نے مامون کے عہد میں سالانہ جمع ہونے والے خراج کی جو تفصیل درج کی ہے وہ اُنھوں نے ابنِ خلدون کے مقدمے سے نقل کی ہے ۔ اسے درج کرتے وقت یہ وضاحت کر دی ہے کہ خراج کا نقشہ مامون کے سرکاری کاغذات سے تیار کیا گیا ہے اور علامہ خلدون نے اس کاغذ کو خود دیکھا تھا[1] ۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے ، سلسلۂ ناموران اسلام لکھتے وقت شبلی کے پیشِ نظر یہ مقصد بھی تھا کہ ناموران ِاسلام کے پرعظمت حالات بیان کر کے مسلمانوں کے دلوں سے اُس احساسِ کمتری کو دور کیا جائے جو جنگِ آزادی میں شکست کے بعد ان کے دلوں میں پیدا ہو گیا تھا ۔ اُس مقصد کو حاصل

---

۱ ۔ المامون ، صفحہ ۱۰۳

کرنے کے لیے ضروری تھا کہ شبلی ، صاحبِ سوانح کی عظمت کا نقش ابھاریں چنانچہ انھوں نے المامون میں جا بجا ایسے واقعات بھی بیان کیے ہیں جن سے مامون کی بڑائی کی تصویر سامنے آ جاتی ہے ۔ ایک جگہ عبداللہ بن طاہر کے حوالے سے یہ بیان نقل کرتے ہیں کہ ایک دن وہ مامون کی خدمت میں حاضر تھے، مامون نے غلام کو آواز دی مگر صدائے برنخاست ، پھر پکارا تو ایک ترکی غلام حاضر ہوا ، اور آتے ہی بڑ بڑانے لگا کہ کیا غلام کھاتے پیتے نہیں ، جب ذرا کسی کام کے لیے باہر گئے تو آپ ''یا غلام ، یا غلام'' چلانے لگتے ہیں ، آخر ''یا غلام'' کی کوئی حد بھی ہے ۔

یہ سن کے مامون نے سر جھکا لیا اور دیر تک سر بگریباں رہا ۔ عبداللہ بن طاہر کا خیال تھا کہ جواب سن کر مامون غلام کی خوب خبر لے گا مگر مامون اس کی امید کے خلاف اس سے مخاطب ہو کر کہنے لگا : ''نیک مزاجی میں یہ بڑی آفت ہے کہ نوکر اور غلام شریر اور بد خو ہو جاتے ہیں مگر یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ان کے نیک خو کرنے کے لیے میں بد مزاج بنوں[1] ۔''

یہ واقعہ سن کر کون ہے جو مامون کے کردار کی عظمت پر عش عش نہ کر اٹھے گا ۔ اسی طرح کے اور بھی سیکڑوں قصے ہیں جنھیں بیان کرکے شبلی نے اپنا مقصد پانے کی کامیاب کوشش کی ہے ۔

سلسلۂ ناموران اسلام کی تصنیف کا ایک اور مقصد یہ تھا کہ انگریزوں اور دوسرے مورخوں کی پھیلائی ہوئی

---

۱ ۔ المامون ، صفحہ ۱۴۹

غلط فہمیوں کو دور کیا جائے ، المامون میں اس سلسلے کی صرف ایک ہی مثال ملتی ہے ۔

پامر نے اپنی کتاب ''ہارون رشید'' میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ''ہارون رشید کے بیہودہ درباریوں نے یہ بات اس کے ذہن نشین کر دی تھی بلکہ کل پیرو اسلام اس بات کو اس وقت اور کچھ مسلمان اب بھی سمجھتے ہیں کہ کافر خدا کی مخلوق ہی نہیں کہلا سکتا ۔

شبلی نے اس الزام کو قطعی غلط ٹھہراتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر یہ بات صحیح ہوتی تو مسلمان اپنی حکومت کے زمانے میں ہزاروں، لاکھوں چرچوں اور گرجوں کی حفاظت کے معاہدے کیوں لکھتے اور عمر بن عبدالعزیز کو جنھوں نے ولید کے گرائے ہوئے ایک گرجے کو مسجد کا کچھ حصہ ڈھا کر دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت دی تھی عمر ثانی کیوں تسلیم کیا جاتا ۔ آگے چل کر وہ کہتے ہیں : ''خاص دولتِ عباسیہ کے عہد میں دارالخلافہ بغداد میں سیکڑوں ، ہزاروں گرجے تعمیر ہوئے جہاں نہایت آزادی سے ہر قسم کی مذہبی رسوم ادا کی جا سکتی تھیں ۔ بقول ان کے تاریخ کے ہر صفحے میں مسلمانوں کی بے تعصبی کی شہادت ملے گی ، کیا ان سب باتوں کو دیکھ کر پامر کے لگائے ہوئے الزام کو درست قرار دیا جا سکتا ہے[۱] ۔''

فنی لحاظ سے المامون کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ شبلی نے ایک بڑے انشا پرداز اور مزاجاً شاعر ہونے کے باوجود کہیں بھی بلا ضرورت اپنی رنگین بیانی کے جوہر دکھانے کی کوشش نہیں کی، جو عبارت بقول سرسید: ''خوبصورت ہے خوبصورت ہے

---

۱ - المامون ، صفحہ ۱۲۴ ، ۱۲۵

جو بھونڈی ہے بھونڈی ہے، نہ خوبصورتی کو زیادہ خوبصورت بنایا ہے نہ بھونڈے پن کو زیادہ بھونڈا اور در حقیقت یہی کمال تاریخ نویسی کا ہے[۱] ۔"

النعمان :

المامون کے بعد ۱۸۹۱ع میں شبلی نے سلسلۂ ناموران اسلام میں النعمان لکھی، یہ اس سلسلے کی دوسری کڑی ہے ۔ شبلی کا کہنا ہے : "اول اول ان کے دل میں ناموران اسلام لکھنے کا خیال نہایت وسیع بنیاد پر پیدا ہوا تھا ۔ ان کا ارادہ تھا کہ جس طرح انھوں نے خلافت و سلطنت کے مختلف خاندانوں سے نامور انتخاب کیے ، اسی طرح علوم و فنون کے جدا جدا خاندان قائم کیے جائیں اور جو لوگ خاص خاص فنون میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے ان کو اس سلسلے کا ہیرو قرار دیا جائے مگر تنہا آدمی کے لیے اتنے پھیلاؤ کا کام کرنا ممکن نہیں تھا چنانچہ شبلی نے سلسلۂ حکومت سے بھی بہت سے خاندان چھوڑ دیے لیکن یہ خیال برابر ان کے دل میں رہا کہ فرصت ہو تو اہل کمال کا دربار بھی سجایا جائے[۲] ۔"

اتفاق دیکھیے کہ "المامون" کے بعد "الفاروق" لکھتے لکھتے بعض مجبوریوں کے باعث شبلی کو اس کام سے ہاتھ اٹھا لینا پڑے ، فرصت ملی تو دل میں پھر یہ خیال پیدا ہوا کہ علمی ناموروں کے کارنامے لکھے جانے چاہیے چنانچہ وہ علمی سلسلے کی طرف متوجے ہوئے ۔

وہ امام ابو حنیفہ کے ہمیشہ سے عقیدت مند تھے ، ان کی اسی عقیدت کی بناء پر مولانا فاروق چڑیا کوٹی نے ان کے

---

۱ - سرسید ، دیباچہ المامون صفحہ د

۲ - شبلی ، النعمان صفحہ ٦

نام کے بعد نعمانی لکھنا شروع کر دیا تھا' ۔ عقیدت مند شبلی کے دل میں علمی شخصیتوں کے کارنامے لکھنے کا خیال آیا تو بھلا ان کی نظر امام ابو حنیفہ کے علاوہ اور کہاں ٹھیرتی ، چنانچہ فوراً ان کا انتخاب ہو گیا اور شبلی نے اس سلسلے میں سب سے پہلے انھی پر لکھنے کا فیصلہ کیا ۔

شبلی کی کوئی بھی تصنیف دیکھیے خواہ اُس کا تعلق کلیتاً تاریخ سے الگ ہٹ کر ہی کیوں نہ ہو وہ برابر اس جستجو میں نظر آتے ہیں کہ جو کچھ لکھیں اُس کا رشتہ کسی نہ کسی صورت تاریخ سے مل ضرور جائے ۔ چنانچہ النعمان میں بھی شبلی کی یہی جستجو بروئے کار نظر آتی ہے ۔ حالانکہ دو حصوں میں منقسم اس تصنیف کا دوسرا حصہ جس کی ضخامت کتاب کے تقریباً تین چوتھائی حصے پر مشتمل ہے ، شبلی نے امام ابو حنیفہ کی تصانیف پر تبصرے کے لیے وقف کر رکھا ہے ۔ پھر بھی النعمان کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شبلی کا مرکز خیال خواہ وہ کچھ ہی کریں تاریخ ہوتی ہے ۔ وہ اول و آخر ایک مورخ ہیں چنانچہ جو کچھ بھی دیکھتے ہیں مورخ کی آنکھ سے دیکھتے ہیں ، پھر بھلا یہ کیسے ہوتا کہ مورخ کی وہ عینک جو ہر وقت ان کی آنکھوں پر چڑھی رہتی ہے وہ یہاں اتار پھینکتے ۔ پہلے حصے کا ذکر تو خیر جانے دیجیے کہ وہ سراسر ایک مورخ کے قلم کی گلکاریوں کا نتیجہ ہے ، یہاں صرف دوسرے حصے کو لیجیے ، کہنے کو تو یہ حصہ شبلی نے امام صاحب کی تصانیف پر تبصرے کے لیے وقف کیا ہے لیکن ان کی تصانیف پر تبصروں کی قسمت میں صرف چند ہی اوراق لکھے تھے ۔ اس حصے

---

۱ ۔ تمکین کاظمی، شبلی نمبر (صبا حیدر آباد) صفحہ ۲۱

میں زیادہ تر شبلی نے ادھر اُدھر کے مسائل چھیڑ کر ان پر بحث کی ہے اور جب بات چھڑ جائے تو ظاہر ہے مورخ شبلی، اُن کی شخصیت کے دوسرے تمام پہلوؤں پر ہمیشہ فوقیت لے جاتا ہے۔ چنانچہ لکھتے لکھتے بیچ بیچ میں شبلی اپنی بات سمجھانے کے لیے مثال کے طور پر اسلامی تاریخ کے حوالے بھی دیتے جاتے ہیں۔ یوں تو یہ تذکرے اور حوالے محض منہ کا مزہ بدلنے کے لیے ہوتے ہیں لیکن اسے کیا کیا جائے کہ ہر دو ایک صفحوں کے بعد شبلی کے منہ کا مزہ خراب ہو جاتا ہے اور وہ کوئی تاریخی واقعہ بیان کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

کتاب کے پہلے حصے میں صرف مورخ شبلی کا راج ہے، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے سلسلۂ ناموران اسلام لکھتے وقت شبلی کے پیش نظر چند مقاصد تھے، انھی مقاصد کو اساس بنا کر انھوں نے تاریخیں لکھی ہیں چنانچہ فن اور مقصدیت کے لحاظ سے النعمان، المامون سے کچھ زیادہ مختلف نہیں، موضوع کی خشکی اور بے کیفی دور کرنے کے لیے جگہ جگہ دلچسپ واقعات کا بیان، اور برابر یہ کوشش کہ اُن کی کہی ہوئی ہر بات ایسے شخص سے روایت ہو جس کا تعلق کسی نہ کسی صورت سے کہی جانے والی بات سے ضرور ہو اور پھر وہی مختاف پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کرنے کا انداز۔ یہ سب کچھ شبلی کی ہر تصنیف میں ملتا ہے، اور یہ سب خوبیاں النعمان میں بھی مجتمع ہیں۔

شبلی کی تاریخ سے متعلق دوسری تصانیف کی طرح النعمان کی بھی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ شبلی نے ایک اچھے مورخ اور تاریخ نویسی کے ایک حق پسند نبض شناس کی طرح کہیں بھی سچائی کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ امام ابو حنیفہ

سے انتہائی عقیدت کے باوجود وہ امام صاحب کی بیجا تعریف سننا یا کرنا نہیں چاہتے۔ ایک جگہ رقم طراز ہیں :

"ہمارے تذکرہ نویسوں نے امام کے اخلاق و عادات کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں خوش اعتقادی اور مبالغے کا اس قدر رنگ بھرا ہے کہ امام صاحب کی اصلی صورت اچھی طرح پہچانی نہیں جاتی ، چالیس برس تک عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی ، تیس برس تک متصل روزے رکھے۔ جہاں وفات کی ، اس جگہ سات ہزار بار قران ختم کیا - نہر کوفہ میں مشتبہ گوشت کا ٹکڑا پکڑا گیا تو اس خیال سے کہ مچھلیوں نے کھایا ہو گا اور مچھلیاں بہت دنوں تک زندہ رہتی ہیں ، ایک مدت تک مچھلی نہیں کھائی . . . . . یہ اور بہت سے افسانے ان کی نسبت مشہور ہیں اور لطف یہ کہ ہمارے مورخین انھی دور از کار قصوں کو امام کے کمالات کا جوہر سمجھتے ہیں حالانکہ یہ واقعات نہ تاریخی اصول سے ثابت ہیں نہ ان سے کسی کے شرف پر استدلال ہو سکتا ہے[۱] -"

بظاہر مسلمان مورخین نے، جن کا ذکر کرتے ہوئے شبلی نے مندرجہ بالا سطور لکھی ہیں یہ سب باتیں امام صاحب کی تعریف میں کہی ہیں لیکن شبلی کو اپنے کسی ہیرو کی بھی ایسی تعریف گوارا نہیں جس میں ذرا سا بھی جھوٹ کا شائبہ نکلتا ہو اسی لیے انھوں نے ان بیانات کی تردید ضروری سمجھی -

یہاں تک توبات ٹھیک ہے لیکن النعمان میں فنِ تاریخ نویسی کے لحاظ سے یہ خامی بہت کھلتی ہے کہ شبلی نے اپنی عادت کے خلاف تصویر کا صرف ایک رخ دکھایا ہے جس کی وجہ سے

---

۱ - النعمان ، صفحہ ۱۷

یہ تصنیف ادھوری سی لگتی ہے۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ شبلی نے کہیں محض خوش اعتقادی کی وجہ سے کوئی غلط بات نہیں کہی۔ اسی بات کو دیکھتے ہوئے الطاف فاطمہ نے کہا ہے: "اس میں حقیقت زیادہ اور خوش اعتقادی کم ہے[۱]۔"

الفاروق :

النعمان کے بعد سلسلۂ ناموران اسلام کی تیسری سیڑھی شبلی نے الفاروق کو بغل میں لے کر طے کی، اس کتاب کا سال تصنیف ۱۸۹۹ع ہے۔ شبلی نے اسے اپنی بہترین تصنیف قرار دیا ہے۔ "وہ اسے اپنی غزل مرصع سمجھتے تھے[۲]۔"

اُن کی اکثر کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی دو حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصے میں حضرت عمرؓ کی زندگی کے واقعات ہیں اور دوسرے میں ان کے عہد خلافت کے انتظامی، تمدنی اور معاشرتی حالات کا ذکر۔

ترتیب کے لحاظ سے الفاروق کے پہلے حصے کو پہلے چھپنا چاہیے تھا اور دوسرے کو بعد میں لیکن معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ پہلے دوسرا حصہ شائع ہوا اور پھر پہلا۔ یہ بات یوں ثابت ہوتی ہے کہ شبلی نے اپنے خط میں مہدی افادی کو لکھا ہے: "الفاروق کان پور میں مطبع نامی سے بڑے اہتمام سے چھپ رہی ہے، ایک حصہ جس کے ۳۱۲ صفحے ہیں چھپ کر تیار ہوگیا ہے[۳]۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب کا دوسرا

---

۱ - الطاف فاطمہ، اُردو میں فن سوانح نگاری صفحہ ۱۲۴

۲ - شیخ عطا اللہ، مقالات یوم شبلی صفحہ ۱۵۹

۳ - خط نمبر ۸ بنام مہدی افادی، مکاتیب شبلی جلد دوم صفحہ ۱۹۷

حصہ پہلے شائع ہوا کیونکہ پہلے ایڈیشن میں وہ ۳۱۲ صفحات پر مشتمل تھا[1]۔ کتاب کے دوسرے حصے میں شبلی نے جس تحقیق و جستجو سے کام لیا ہے، غالباً اُسی کے پیش نظر وہ اس حصے کو پہلے عوام کے سامنے لانے کے لیے بے چین تھے اسی لیے انھوں نے دوسرا حصہ پہلے چھپوایا۔

المامون کے بعد شبلی کا ارادہ الفاروق لکھنے کا تھا لیکن بعض مجبوریوں کے باعث وہ اُس موقعے پر اپنی خواہش پوری نہ کرسکے۔ اس بات کا اظہار انھوں نے النعمان کے دیباچے میں بھی کیا ہے جو جنوری ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئی، لکھتے ہیں:

"المامون کے بعد میں نے الفاروق لکھنی شروع کی تھی اور ایک معتدبہ حصہ بھی لکھ لیا تھا، لیکن بعض مجبوریوں سے چند روز کے لیے اس کی تالیف سے ہاتھ اٹھانا پڑا[2]۔"

شبلی نے اس دیباچے میں باقاعدہ یہ وضاحت کر دی ہے کہ یہ مجبوریاں صرف اور صرف چند کتابوں کے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے تھیں۔ پھر بھی مولانا سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ الفاروق کی تالیف میں رکاوٹ کا باعث سرسید بنے، ان کا کہنا ہے کہ ایم۔ اے۔ او کالج مسلمانوں کو متحد کرنے کے لیے وجود میں آیا تھا، سرسید کو اس کے قیام کا یہ مقصد بہت عزیز تھا۔ وہ گھبراتے تھے کہ کہیں الفاروق کی تصنیف سے کالج میں شیعہ سنی تفرقہ پیدا نہ ہو جائے، اس تصنیف کی خاطر وہ کالج کے قیام کے ایک بنیادی مقصد کو قربان کرنے کے لیے تیار نہ تھے، اس کا اظہار ان کے خطوط اور ایک آدھ بیان سے بھی ہوتا ہے۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ، مارچ

۱۔ حیات شبلی، صفحہ ۳۲۳

۲۔ النعمان، صفحہ ۶

۱۸۹۳ع میں سرسید لکھتے ہیں : ''ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا کرے مولوی شبلی، الفاروق نہ لکھیں[۱] ۔'' شبلی کو سرسید کے اس خیال سے اتفاق نہ تھا ، کچھ عرصے تک تو وہ آن کے ادب میں چپ رہے پھر انھوں نے سرسید کو مشورہ دیا کہ وہ اس سلسلے میں نواب سید حسین بلگرامی سے مشورہ کریں جو شیعہ ہونے کے علاوہ کالج کے ہمدردوں میں بھی شمار ہوتے تھے ، چنانچہ سرسید نے انھیں خط لکھا جس کا جواب بقول مولانا شبلی یہ آیا کہ ''اسلام نے ایک فاروق پیدا کیا ہے اور حیف ہے کہ اس کی سوانح عمری بھی نہ لکھی جائے[۲] ۔''

چنانچہ یوں خاصے التوا میں پڑے رہنے کے بعد الفاروق کی تصنیف کا کام شروع ہوا ۔ اب تک تو ہندوستان میں ملنے والے علمی سرمائے نے مولانا کا ساتھ دیا تھا لیکن الفاروق کی تصنیف کے لیے انھیں جو سرمایہ یہاں ملا اس سے ان کی تشنگی دور نہ ہوئی چنانچہ انھوں نے اپنے محققانہ اور مورخانہ ذوق کی تسکین کے لیے مصر ، ترکی اور شام کے سفر کا ارادہ کیا اور پھر اس ارادے کو عملی شکل دی ، ہندوستان کی علمی تاریخ میں یہ پہلا سفر تھا جو محض علمی شوق پورا کرنے کے لیے کیا گیا ۔ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ کر شبلی نے ''الفاروق کے لیے جن کتابوں سے معلومات ان کو مل سکتی تھیں ان کا مطالعہ کیا اور ان سے ضروری اقتباسات لکھ کر اپنے ساتھ لائے[۳] ۔'' آن کتب میں طبقات ابن سعد ، سیرۃ العمر بن امام جوزی ، انتساب الاشراف بلازری ، اخبار القضاۃ ،

---

۱ ۔ حیات شبلی صفحہ ۲۳۶

۲ ۔ ایضاً صفحہ ۲۳۱

۳ ۔ ایضاً صفحہ ۱۹۹

محمد بن خلف اور محاسن الوسائل الی اخبار الاوائل وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن کے حوالے الفاروق میں موجود ہیں۔

جیساکہ پہلے بھی ذکر آچکا ہے شبلی کی مورخانہ کاوشوں کے پیچھے ان کا یہ مقصدی پہلو کارفرما تھا کہ انگریزوں کے پھیلائے ہوئے زہریلے مادے کی روک تھام کے لیے تریاق تیار کیا جائے۔ اس کا علاج یہی تھا کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جاتا۔ انگریزوں نے اپنی سیاسی تدابیر یا زیادہ صحیح لفظوں میں اپنے سیاسی ہتھکنڈوں سے ہندوستانیوں اور خاص طور پر مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی تھی کہ سیاسی تدبیر میں انگریزوں کا جواب نہ کبھی پیدا ہوا اور نہ کبھی ہو سکتا ہے۔ شبلی کی حساس طبیعت ان مبالغہ آمیز اور پر فریب باتوں کو کہاں برداشت کرسکتی تھی، انھیں ان کا توڑ کرنے کی سوجھی۔ چنانچہ انھوں نے حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں ہاتھ دیا اور ان کی رفاقت میں آگے بڑھے۔

حضرت عمرؓ کی روحانی، مذہبی اور شخصی عظمت سے تو دنیا واقف تھی اس لیے شبلی نے ان کے سیاسی نظامِ حکومت کو منظر عام پر لانے کی طرف زیادہ توجہ کی اور اپنے مورخانہ، عالمانہ اور محققانہ طرزِ تحریر اور استدلال سے یہ ثابت کر دیا کہ اہلِ یورپ جس سیاسی نظامِ حکومت پر آج ناز کرتے ہیں اس کا ایک حیرت انگیز سبق آج سے تیرہ سو برس قبل حضرت عمرؓ پڑھا چکے تھے۔

شبلی نے حضرت عمرؓ کے قائم کردہ نظامِ حکومت کا جو نقشہ کھینچا ہے ذرا اس پر اچٹتی سی نظر ڈالیے۔ یہ معلوم

ہوتا ہے کہ ہم آج سے تیرہ سو برس پہلے کی دنیا میں نہیں بلکہ آج کی جیتی جاگتی دنیا میں گھومتے پھر رہے ہیں -

ملک میں جمہوری حکومت اور ایسی جمہوری حکومت جس کا آج تصور بھی ناممکن ہے قائم تھی - "کوئی امر بغیر مشورت اور کثرتِ رائے کے عمل میں نہیں آسکتا تھا - مجلسِ شوریٰ کے انعقاد کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے ایک منادی اعلان کرتا کہ "الصلواۃ جامعتہ" یعنی سب لوگ نماز کے لیے جمع ہو جائیں - جب لوگ جمع ہو جاتے تو حضرت عمرؓ مسجدِ نبوی میں جاکر دو رکعت نماز پڑھتے تھے ، نماز کے بعد منبر پر چڑھ کر خطبہ دیتے تھے اور پھر بحث طلب امر پیش کیا جاتا تھا - معمولی اور روزمرہ کے کاروبار میں اس مجلس کے فیصلے کافی سمجھے جاتے تھے لیکن جب کوئی اہم امر پیش آتا تھا تو مہاجرین و انصار کا اجلاسِ عام ہوتا تھا اور سب کے اتفاق سے وہ امر طے پاتا تھا[۱] -" "مجلس شوریٰ کے علاوہ عام رعایا کو بھی انتظامی امور میں مداخلت حاصل تھی صوبہ جات اور اضلاع کے حاکم اکثر رعایا کی مرضی سے مقرر کیے جاتے تھے بلکہ بعض اوقات بالکل انتخاب کا طریقہ عمل میں آتا تھا[۲] -" "تمام عمال کو حکم تھا کہ ہر سال حج کے زمانے میں حاضر ہوں - حج کی تقریب سے تمام اطراف کے لوگ موجود ہوتے تھے - حضرت عمرؓ کھڑے ہو کر اعلان کرتے تھے کہ جس کو کسی عامل سے کچھ شکایت ہو پیش کرے ، چنانچہ ذرا ذرا سی شکایتیں پیش ہوتی تھیں اور تحقیق

---

۱ - الفاروق صفحہ ۱۴۰

۲ - ایضاً صفحہ ۱۴۱

ہو کر اس کا تدارک کیا جاتا تھا ۱ ۔'' ''عمال کی دیانت اور راستبازی قائم رکھنے کے لیے نہایت عمدہ اصول اختیار کیا تھا کہ تنخواہیں بیش قرار مقرر کی تھیں ۔ یورپ نے مدتوں کے تجربے کے بعد یہ اصول سیکھا ہے۲'' ۔

محاصل ، عدالت ، بیت المال ، فوجداری ، پولیس ، پبلک ورک، فوج، تعلیم ، مذہب غرض کہ ہر اس چیز کے محکمے قائم تھے جن کی ایک ترقی یافتہ قوم کو ضرورت ہوتی ہے ۔ سنہ ہجری کی ابتدا بھی اسی زمانے میں ہوئی ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جمہوریت کا تصور اہلِ یورپ نے اسلام ہی سے اڑایا ہو ۔ بڑا چھوٹا سب برابر تھے ، نہ کسی سے مال و دولت کی وجہ سے رعایت برتی جاتی تھی نہ کوئی کسی حاکم کا رشتہ دار ہونے کے ناطے فیض پاتا تھا ۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ کسی جرم کی پاداش میں اپنے بیٹوں کو بھی وہی سزا دیتے تھے جو ایک مجرم کو ملنی چاہیے چنانچہ ''آن کے بیٹے ابوشحمہ نے جب شراب پی تو خود اپنے ہاتھ سے ان کو اسی (۸۰) کوڑے مارے اسی صدمے سے وہ بے چارے قضا کر گئے ۳ ۔''

''الفاروق'' شبلی کی دوسری تصانیف سے کسی حد تک مختلف ہے ، اپنی دوسری تصانیف میں شبلی تاریخ کی دلفریب وادیوں میں ایسے کھو جاتے ہیں کہ انھیں اپنی خبر بھی نہیں رہتی لیکن الفاروق میں ان کی برابر یہ کوشش رہی ہے کہ انھیں ہردم حضرت عمرؓ کی رفاقت میسر رہے چنانچہ پہلی ہجری سے آنحضرتؐ کی وفات تک حضرت عمرؓ کے حالات لکھنے کی ضرورت

---

۱ ۔ الفاروق صفحہ ۹۳ ، ۱۴۸

۲ ۔ ایضاً صفحہ ۱۵۱

۳ ۔ ایضاً صفحہ ۲۲۸

پیش آئی تو شبلی نے محسوس کیا کہ رسول اللہؐ کے حالات زندگی آنکھوں کو اس حد تک خیرہ کر دیں گے کہ حضرت عمرؓ کے حالات صاف نظر نہ آئیں گے چنانچہ وہ یہ کہہ کر پہلو بچا گئے کہ: ''یکم ہجری سے آنحضرت کی وفات تک حضرت عمرؓ کے واقعات اور حالات درحقیقت سیرتِ نبوی کے اجزاء ہیں، اگر یہ واقعات پوری تفصیل سے لکھے جائیں تو کتاب کا یہ حصہ سیرت نبوی سے بدل جاتا ہے کیونکہ حضرت عمرؓ کے کار نامے، گو کتنے ہی عظیم الشان ہوں لیکن چونکہ وہ رسول اللہ صلعم کے سلسلہ حالات سے وابستہ ہیں اس لیے جب قلم بند کیے جائیں گے تو تمام واقعات کا عنوان رسول اللہ صلعم کا نامِ نامی قرار پائے گا اس لیے ہم نے مجبوراً یہ طریقہ اختیار کیا کہ یہ واقعات نہایت اختصار سے لکھے جائیں اور جن واقعات سے حضرت عمرؓ کا خاص تعلق ہے ان کو کسی قدر تفصیل سے لکھا جائے[۱]۔''

ایک اور جگہ انہیں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ کے شانہ بشانہ چلتے دکھائی دیے تو شبلی نے یہ کہہ کر پہلو بچایا کہ: ''حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی مدت سوا دو برس ہے کیونکہ انہوں نے جمادی الثانی ۱۳ھ میں انتقال کیا۔ اس عہد میں اگرچہ جس قدر بڑے بڑے کام انجام پائے حضرت عمرؓ کی شرکت سے انجام پائے تاہم ان واقعات کو ہم الفاروق میں نہیں لکھ سکتے کیونکہ وہ عہدِ صدیقی کے واقعات ہیں اور اس شخص کا حصہ ہیں جس کو حضرت ابوبکرؓ کی سوانح عمری لکھنے کا شرف حاصل ہو۔''

---

۱ - الفاروق صفحہ ۳۰، ۲۹

۲ - ایضاً صفحہ ۹۴

ان دونوں واقعات سے معلوم تو ایسا ہی ہونا ہے کہ شبلی حضرت عمرؓ سے ایک لمحے کی جدائی بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں لیکن ان کی شخصیت کا وہ پہلو جس کا تعلق تاریخ سے ہے کہیں کہیں انہیں بھٹکا دیتا ہے اور وہ حضرت عمرؓ کو اس حد تک بھلا بیٹھتے ہیں کہ مدتوں ان کی خبر نہیں لیتے۔ الفاروق میں یوں تو ایسی سیکڑوں مثالیں مل جائیں گی جہاں شبلی نے حضرت عمرؓ کی رفاقت کو خیرباد کہا لیکن کتاب کے چونسٹھ سے پچاسی صفحے خاص طور پر قابل ذکر ہیں کہ ان صفحات میں جو پچیس پچیس سطروں پر مشتمل ہیں حضرت عمرؓ کا ذکر صرف دس بارہ سطروں میں ملتا ہے اور وہ بھی سرسری سا۔

سلسلۂ ناموران اسلام کی ابتداء جس زمانے میں ہوئی وہ ہندوستان کی تاریخ کا تاریک ترین دور تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب انسانیت اور آدمیت خون کے آنسو روتی ہوئی ہندوستان سے نکل کر پناہ کی تلاش میں کہیں ماری ماری پھر رہی تھی اور یہاں درندگی، ظلم وستم اور بربریت کا راج تھا۔

انگریز نے ہندوستان کے تخت و تاج پر قبضہ کرنے کے بعد ہندوستانی مسلمانوں پر وہ وہ ظلم ڈھائے کہ انہیں دیکھ کر شیطان بھی منہ چھپائے چھپائے پھرتا ہوگا۔ ہندوستانی مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹے پڑ رہے تھے اور کوئی ایسا دردمند نہ تھا جو ان کی داد رسی کو آگے بڑھتا۔ ایسے میں شبلی کے خون نے جوش مارا اور وہ قلم کی تلوار لیے میدانِ جہاد میں اتر آئے۔ سب سے پہلے انھوں نے انگریزوں پر واضح کیا کہ یہ ظلم و ستم جسے تم نے اپنا دین و ایمان بنا لیا ہے، بہادروں کا شیوہ نہیں۔ بہادر تو ایسے ہوتے ہیں کہ جن کی

عظمت کا اعتراف دشمن بھی کریں - شبلی اپنی بات دلائل و براہین کے بغیر کبھی نہیں کہتے - مندرجہ بالا بات کہنے کے لیے بھی انھوں نے چند مثالیں پیش کی ہیں - ذرا ملاحظہ فرمائیے اور دیکھیے کہ ایک پر حشم اور پر عظمت قوم کے طور طریقے بھی اس کی جاہ و حشمت کے ترجمان ہوتے ہیں یا نہیں - ایک جگہ شبلی نے ان چند معاہدوں کو اصل صورت میں چھاپا ہے جو فتحیاب ہونے کے بعد مسلمانوں نے مفتوح اقوام سے کیے - ان سے کہیں بھی تو ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ یہ ایک فتح کے نشے میں چور قوم کے کیے ہوئے معاہدے ہیں - دوسری طرف ذرا ان معاہدوں کو ذہن میں لائیے جو انگریزوں نے ہندوستان میں مفتوح اقوام سے کیے تھے - مسلمانوں کی عظمت اور انگریزوں کی گراوٹ اور پست ذہنیت واضح ہو جائے گی - جن معاہدوں کا ابھی میں نے ذکر کیا ان کی اصل عبارت ملاحظہ فرمائیے - حذیفہ بن الیمان نے ماہ دینار والوں کو جو تحریر لکھی تھی اس کے الفاظ یہ تھے :

لا یغیرون عن ملتہ و لایحال بینھم و بین شرایعھم

یعنی ان کا مذہب نہ بدلا جائے گا اور ان کے مذہبی امور میں دست اندازی نہ کی جائے گی -

جرجان کی فتح کے بعد یہ معاہدہ لکھا گیا :

لھم الامان علی انفسھم و اموالھم و ملھم

یعنی ان کے جان و مال اور مذہب و شریعت کو امان ہے اور اس میں سے کسی شے میں تغیر نہ کیا جائے گا -

آذر بائیجان کے معاہدے میں یہ الفاظ تھے : الامان علی انفسھم و اموالھم و ملھم - یعنی جان و مال و مذہب اور

شریعت کو امان ہے[1]۔" وغیرہ وغیرہ کیا یہ مسلمانوں کی عظمت کی منہ بولتی تصویر نہیں ہیں۔ ایک طرف تو مسلمان مفتوح اقوام پر مظالم ڈھانے کے حق میں نہ تھے حتیٰ کہ وہ ذمّیوں کے بارے میں قوانین خود انہی کی مرضی سے بناتے تھے اور دوسری طرف انگریز تھے جنھوں نے ۱۸۵۷ع کی جنگِ آزادی کا ذمہ دار مسلمانوں کو ٹھیرا کر ان پہ وہ وہ مظالم ڈھائے جن کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ ایک طرف گراوٹ کی یہ مثال ہے اور دوسری طرف شبلی مسلمانوں کی عظمت کا اظہار یوں کرتے ہیں: "اگر ذمیوں نے کبھی سازش یا بغاوت کی تب بھی ان کے ساتھ مراعات کو ملحوظ رکھا۔ شام کی آخری سرحد پر ایک شہر تھا جس کا نام مرادس تھا اور جس کی دوسری سرحد ایشیائے کوچک سے ملی ہوئی تھی۔ شام جب فتح ہوا تو یہ شہر بھی فتح ہوا اور صلح کا معاہدہ ہو گیا لیکن یہاں کے لوگ در پردہ رومیوں سے سازش رکھتے تھے۔ عمیر بن سعد وہاں کے حاکم نے حضرت عمرؓ کو اطلاع دی۔ حضرت عمرؓ نے اُن کی کمینہ خصلت کا جو انتظام کیا وہ یہ تھا کہ عمیر بن سعد کو لکھ بھیجا کہ جس قدر ان کی جائداد، زمین، مویشی اور اسباب ہے سب شمار کر کے ایک ایک چیز کی دو چند قیمت دے دو اور ان سے کہہ دو کہ کہیں چلے جائیں، اگر اس پر راضی نہ ہوں تو ایک برس کی مہلت دو اور اس کے بعد جلا وطن کر دو۔ اس درگذر اور ہمدردانہ طرزِ عمل کا اثر یہ ہوا

[2]

۱۔ الفاروق صفحہ ۲۱۰
۲۔ ایضاً صفحہ ۲۰۸
۳۔ ایضاً صفحہ ۲۱۱

کہ جنگِ یرموک کے پیش آنے کے بعد جب مسلمان حمص سے رخصت ہوئے تو یہودیوں نے توریت ہاتھ میں لے کر کہا کہ جب تک ہم زندہ ہیں کبھی رومی یہاں نہ آنے پائیں گے اور عیسائی بولے: "خدا کی قسم تم رومیوں کی نسبت ہمیں کہیں عزیز ہو[۱]۔"

اپنے دورِ حکومت میں عیسائی مشنریوں اور برائی کے دوسرے اڈوں کے ذریعے انگریزوں نے ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کے لیے جو جو کوششیں کیں وہ اب پوشیدہ نہیں ہیں۔ انگریزوں کے اس طرزِ عمل سے شبلی خفا ہیں اس کا اظہار اشارۃً یوں کرتے ہیں: "اسکندریہ کی فتح کے بعد جب قطبی گرفتار ہوئے تو حضرت عمرؓ نے عمرو کو لکھ بھیجا کہ سب کو بلا کر کہہ دو کہ ان کو اختیار ہے کہ مسلمان ہو جائیں یا اپنے مذہب پر قائم رہیں۔ اسلام قبول کریں گے تو ان کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمانوں کو حاصل ہیں ورنہ جزیہ دینا ہوگا جو تمام ذمیوں سے لیا جاتا ہے۔ اس حکم پر عمرو نے تمام قیدیوں کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ وہ جو مذہب اختیار کرنا چاہیں اس کا اظہار کر دیں چنانچہ کچھ نے مسلمان ہونا پسند کیا اور کچھ نے عیسائی۔ مسلمان فاتحین بیٹھے دیکھا کیے[۲]۔"

ایک طرف انگریز پادری ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے میں مصروف تھے اور دوسری طرف انگریز مورخین اور صاحبِ اقتدار لوگ برابر اس کوشش میں تھے کہ کسی طرح

---

۱ - الفاروق صفحہ ۲۱۲

۲ - ایضاً صفحہ ۱۲۷

ہندوستانیوں اور خاص طور پر مسلمانوں کی تاریخ کو مسخ کر کے رکھ دیا جائے ۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے انھوں نے کوششیں شروع کیں تو شبلی ڈھال بن کر آگے بڑھے ۔ انھوں نے انگریزوں کے ہر وار کو اس مستعدی اور جانفشانی سے روکا کہ انگریز بھی دنگ رہ گئے ہوں گے ۔ شبلی کی ڈھال ان کا آئینۂ تحقیق و تنقید ہے ۔ وہ ہر بات کا جواب ایسے استدلال سے دیتے ہیں کہ دم مارنے کی گنجائش نہیں رہتی ۔ یوں تو اس سلسلے کی مثالیں کتاب کے صفحے صفحے پر بکھری پڑی ہیں لیکن طوالت کے خوف سے یہاں صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے ۔ ملاحظہ فرمائیے ، محقق شبلی میدانِ عمل میں ہیں ۔ رسول اللہ کی آخری بیماری کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''بیماری کا بڑا مشہور واقعہ قرطاس کا واقعہ ہے ۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ آپ نے وفات سے تین روز پہلے قلم اور دوات طلب کیا اور فرمایا کہ میں تمھارے لیے ایسی چیز لکھوں گا کہ تم آئندہ گمراہ نہ ہو ۔ اس پر حضرت عمرؓ نے لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ آنحضرتؐ کو درد کی شدت ہے اور ہمارے لیے قرآن کافی ہے ۔ حاضرین میں سے بعضوں نے کہا کہ رسول اللہ بہکی باتیں کر رہے ہیں (نعوذ باللہ) ۔

یہ واقعہ تعجب انگیز ہے ۔ ایک معترض کہہ سکتا ہے کہ اس سے زیادہ اور کیا گستاخی اور سر کشی ہوگی کہ جناب رسول اللہ صلعم بستر مرگ پر ہیں اور امت کے درد اور غمخواری کے لحاظ سے فرماتے ہیں کہ لاؤ میں ایک ہدایت نامہ لکھ دوں جو تم کو گمراہی سے محفوظ رکھے ۔ یہ ظاہر ہے کہ گمراہی سے بچانے کے لیے جو ہدایت ہوگی وہ منصبِ نبوت کے لحاظ سے ہوگی اور اس لیے اس میں سہو و خطا کا احتمال نہیں

ہو سکتا - باوجود اس کے حضرت عمرؓ بے پروائی ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کچھ ضروری نہیں ہم کو قرآن کافی ہے - طرّہ یہ کہ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت عمرؓ ہی نے آنحضرتؐ کے اس ارشاد کو ہذیان سے تعبیر کیا تھا (نعوذ باللہ) -

یہ اعتراض ایک مدت سے چلا آتا ہے اور مسلمانوں کے دو مختلف گروہوں نے اس پر بڑی طبع آزمائیاں کی ہیں لیکن چونکہ اس بحث میں غیر متعلق باتیں چھڑ گئیں اور اصولِ درایت سے کسی نے کام نہیں لیا اس لیے اصل مسئلہ نا منفصل رہا اور عجیب عجیب بیکار بحثیں پیدا ہو گئیں - یہاں تک کہ یہ مسئلہ چھیڑا گیا کہ پیغمبر سے ہذیان ہونا ممکن ہے کیونکہ ہذیان انسانی عوارض میں ہے اور آنحضرتؐ عوارضِ انسانی سے بری نہ تھے - یہاں دراصل یہ امر غور طلب ہے کہ جو واقعہ جس طریقے سے روائتوں میں منقول ہے اس سے کسی امر پر استناد ہو سکتا ہے یا نہیں - اس بحث کے لیے واقعاتِ ذیل کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے -

۱ - آنحضرت کم وبیش ۱۳ دن تک بیمار رہے -

۲ - کاغذ طلب کرنے کا واقعہ جمعرات کے دن کا ہے - جیسا کہ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں بتصریح مذکور ہے - اور چونکہ آنحضرتؐ نے دوشنبہ کے دن انتقال فرمایا ، اس لیے اس واقعے کے بعد آنحضرت چار دن تک زندہ رہے -

۳ - اس تمام مدتِ بیماری میں آنحضرتؐ کی نسبت اورکوئی واقعہ اختلالِ حواس کا کسی روایت میں کہیں مذکور نہیں -

۴ - اس واقعے کے وقت کثرت سے صحابہ موجود تھے ، لیکن یہ حدیث باوجود اس کے کہ بہت سے طریقوں سے مروی ہے (چنانچہ صحیح بخاری میں سات طریقوں سے مذکور ہے)

با ایں ہمہ بجز عبداللہ بن عباس کے اور کسی صحابی سے اس واقعے کے متعلق ایک حرف بھی منقول نہیں۔

۵ ۔ عبداللہ بن عباس کی عمر اس وقت صرف تیرہ چودہ برس کی تھی۔

۶ ۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جس وقت کا یہ واقعہ ہے اس موقع پر عبداللہ بن عباس موجود نہ تھے اور یہ معلوم نہیں کہ یہ واقعہ انھوں نے کس سے سنا۔

۷ ۔ تمام روایتوں میں مذکور ہے کہ جب آنحضرتؐ نے قلم کاغذ مانگا تو لوگوں نے کہا کہ رسول اللہؐ بہکی ہوئی باتیں کر رہے ہیں۔

ان سب سے پہلے یہ امر لحاظ کے قابل ہے کہ جب اور کوئی واقعہ یا قرینہ آنحضرتؐ کے اختلالِ حواس کا کہیں کسی روایت میں مذکور نہیں ، صرف اس قدر کہنے سے کہ قلم دوات لاؤ لوگوں کو ہذیان کا خیال کیوں کر پیدا ہو سکتا تھا ------------ یہ روایت اگر خواہ مخواہ صحیح سمجھی جائے تب بھی اس قدر بہر حال تسلیم کرنا ہوگا کہ راوی نے روایت میں وہ واقعات چھوڑ دیے ہیں جن سے لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ آنحضرتؐ ہوش میں نہیں ہیں اور بے ہوشی کی حالت میں قلم دوات طلب کر رہے ہیں - پس ایسی روایت سے جس میں کہ راوی نے واقعے کی نہایت ضروری خصوصیتیں چھوڑ دیں کسی واقعے پر کیوں کر استدلال ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ جب ان امور کا لحاظ کیا جائے کہ اتنے بڑے عظیم‌الشان واقعے میں تمام صحابہ میں سے صرف حضرت عبداللہ بن عباس اس کے راوی ہیں اور یہ کہ ان کی عمر اس وقت تیرہ چودہ سال کی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خود اس واقعے

کے وقت موجود نہ تھے تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس روایت کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے[1]۔"

شبلی اپنے ہیرو کو دیے جانے والے ہر الزام کا جواب نہیں دیتے وہ حق پسند ہیں اور حق کو تاریخ نویسی کا اہم ترین اصول جانتے ہیں۔ انھوں نے تحقیق و جستجو سے صرف وہیں کام لیا ہے جہاں انھوں نے دیکھا کہ کسی پر جھوٹا الزام لگایا جا رہا ہے، فالتو استدلال انھیں گوارا نہیں، جہاں انھیں اپنے ہیرو کا کوئی کمزور پہلو دکھائی دیتا ہے وہ فوراً اسے بھی تسلیم کر لیتے ہیں چنانچہ جب حضرت عمرؓ پر یہ الزام لگایا گیا کہ انھوں نے حضرت فاطمہؓ کو ان کے گھر میں آگ لگانے کی دھمکی دی تھی تو شبلی نے کوئی تاویل گھڑنے کے بجائے فوراً مان لیا کہ درایت کے اعتبار سے اس واقعے کو نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ حضرت عمرؓ کی تندی اور تیز مزاجی سے یہ حرکت کوئی بعید نہیں۔

شبلی جہاں اپنے ہیرو کی کمزوریاں تسلیم کرتے ہیں وہاں وہ مسلمانوں کے آبا و اجداد کی عظمت کے گیت بھی سناتے جاتے ہیں کہ یہ سلسلۂ ناموران اسلام کی تصنیف کے بنیادی مقاصد میں سے ایک ہے۔ لیکن یہ گیت شاعر شبلی کے ذہن کی پیداوار نہیں ہوتے بلکہ وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں کسی ثقہ راوی کی زبانی کہتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ حضرت عمرؓ کی عظمت اور بلندیٔ کردار کی مثال پیش کی ہے تو اسے ان کے غلام، اسلم سے روایت کیا ہے، لکھتے ہیں: حضرت عمرؓ کے غلام اسلم کا بیان

---

۱ - الفاروق صفحہ ۴۲ تا ۴۴

۲ - ایضاً صفحہ ۴۸

ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ رات کو گشت کے لیے نکلے۔ ایک جگہ دیکھا کہ ایک عورت کچھ پکا رہی ہے اور دو تین بچے رو رہے ہیں۔ پاس جاکر حقیقتِ حال دریافت کی۔ اس نے کہا کہ کئی وقتوں سے بچوں کو کھانا نہیں ملا ہے ان کے بہلانے کے لیے خالی ہانڈی میں پانی ڈال کر چڑھا دی ہے۔ حضرت عمرؓ اسی وقت اٹھے اور مدینہ میں آکر بیت المال سے آٹا، گوشت، گھی اور کھجوریں لیں اور اسلم سے کہا، میری پیٹھ پر رکھ دو۔ اسلم نے کہا: ''میں لیے چلتا ہوں۔'' فرمایا ''قیامت میں میرا بار تم نہیں اٹھاؤ گے۔'' غرض سب چیزیں خود لاد کر لائے اور عورت کے آگے رکھ دیں۔ اس نے آٹا گوندھا، ہانڈی چڑھائی۔ حضرت عمرؓ خود چولہا پھونکتے جاتے تھے، کھانا تیار ہوا، بچوں نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ حضرت عمرؓ دیکھتے اور خوش ہوتے۔ عورت نے کہا۔ خدا تمھیں جزائے خیر دے۔ سچ یہ ہے امیر المومنین ہونے کے قابل تم ہو نہ کہ عمرؓ [1]۔'' یہ ہے شبلی کی زبانی اسلام کے خلیفہ کا حال۔ یہ اسلام کی بلندی کی نشانی نہیں ہے تو اور کیا ہے کہ اس کا خلیفہ اپنے لیے قوم کی خدمت کو عین سعادت جانتا ہے۔

شبلی صرف جنگ وجدل کے ذکر اور لڑائیوں کے حالات بیان کرنے ہی کو تاریخ نہیں سمجھتے بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ تہذیب و تمدنِ انسانی کے ذکر کے بغیر تاریخ کا تصور ممکن نہیں۔ وہ جہاں جنگ وجدل کے واقعات بیان کرتے ہیں وہاں تہذیب و تمدن کی تصویر کشی بھی کرتے جاتے ہیں بقول ڈاکٹر سید عبداللہ: ''اس کتاب میں شبلی نے یہ ثابت کر دیا ہے

۱ - الفاروق صفحہ ۲۳۶

کہ صحیح تاریخ صرف جنگوں اور لڑائیوں کا نام نہیں بلکہ اصل تاریخ تہذیبِ انسانی کا دوسرا نام ہے'۔''

شبلی کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ جہاں وہ اور بہت کچھ ہیں وہاں ایک شاعر بھی ہیں۔ کبھی کبھی لکھتے لکھتے مورخ شبلی میں شاعر شبلی کی روح حلول کر آتی ہے اور وہ ایسے واقعات بھی لکھ جاتے ہیں جو مورخ کو زیب نہیں دیتے مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں: ''دونوں باپ بیٹے فوج میں گھسے اور اس دلیری سے جنگ کی کہ مسلمانوں کے اکھڑے ہوئے پاؤں پھر سنبھل گئے۲'' ۔ یہاں بھی بظاہر شاعر شبلی کا ذہن کام کر رہا ہے۔ بھلا دو آدمیوں کی بدولت جنگ کا پانسہ کیسے پلٹ سکتا ہے، یہ شاعر اور مورخ شبلی کے ملاپ کا نتیجہ ہے۔ لیکن یہ ملاپ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ شاعرانہ خواہشات کے پورا کرنے کی گنجائش ہونے کے باوجود شبلی نے ان سے فائدہ نہیں اٹھایا مثلاً حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام کا واقعہ ایسا ہے کہ اس کے بیان کو شاعرانہ الفاظ میں نہایت عمدگی سے بیان کرنے کی گنجائش تھی لیکن شبلی اس موقع سے فائدہ اٹھائے بغیر خاموشی سے گزر گئے۔

مختصراً یہ کہ الفاروق میں شبلی نے تاریخ نویسی کی تمام خصوصیات کو یکجا کر دیا ہے۔ وہ اسے اپنی بہترین تصنیف سمجھتے تھے اور یہ ہے بھی سچ، شبلی کے جلائے ہوئے دیوں میں یہ سب سے زیادہ روشن ہے۔

۱۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، سر سید اور ان کے رفقاء صفحہ ۵۷-۱۵۶

۲۔ الفاروق صفحہ ۹۵

الغزالی :

سر سید ، الفاروق کی تصنیف کے حق میں نہ تھے ۔ اسی لیے جب شبلی نے الفاروق لکھنے کا ارادہ کیا تو "انھوں نے اس کے بجائے ۱۸۹۲ء میں الغزالی لکھنے کی تحریک کی[1] ۔" لیکن شبلی پہلے الفاروق لکھنا چاہتے تھے اس کے علاوہ الغزالی کے لکھنے میں انھیں چند مجبوریاں بھی در پیش تھیں اس لیے انھوں نے اسے بعد میں لکھنے کا فیصلہ کیا ۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ امام غزالی کی سب کتابوں پر تبصرہ کریں لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے اس موقع پر یہ ممکن نہ تھا ۔ اس مجبوری اور ایک آدھ اور مجبوری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں : "میں نے چند دفعہ الغزالی کے کئی کئی صفحے لکھ کر اسی خیال سے چھوڑ دیے کہ ان کتابوں[2] پر ریویو نہ ہو سکا تو کیا فائدہ ؟ اس کے علاوہ پورے علم کلام کی تاریخ اور اس پر ریویو لکھنا پڑے گا ۔ اس کے سامان کے لیے میں مصر سے کتابیں نقل کرانا چاہتا ہوں ۔ اس کا بھی ابھی سامان نہیں[3] ۔"

الغزالی مولانا کے علم الکلام کے سلسلے کی ایک کڑی تھی جسے انھوں نے خود اپنی سب سے ناقص کتاب تسلیم کیا ہے ، لکھتے ہیں : "میں نے علم الکلام نہایت نا تمام لکھی اور وہ درحقیقت میری تصنیفات کا سب سے ناقص حصہ ہے[4]" ۔

---

۱ ۔ حیات شبلی، صفحہ ۳۵۰

۲ ۔ مراد امام غزالی کی تصانیف سے ہے ۔

۳ ۔ خط نمبر ۱۳ ، بنام حبیب الرحمٰن خان شروانی ، مکاتیب شبلی جلد اول صفحہ ۱۱۷

۴ ۔ خط نمبر ۱۷ ، بنام مولانا حمید الدین بی اے ، مکاتیب شبلی جلد دوم صفحہ ۱۲

الغزالی مولانا کی تصنیفات میں تاریخی اور سوانحی لحاظ سے بھی سب سے ناقص کتاب ہے۔ اس میں مولانا نے امام غزالی کے ذہنی ارتقاء کا تو بڑی اچھی طرح احاطہ کیا ہے لیکن ان کی شخصی زندگی اور اپنے اصول کے خلاف ان کے زمانے کی معاشرتی و تہذیبی تاریخ کو نظر انداز کر گئے ہیں۔ البتہ کہیں کہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ تاریخی واقعات لکھنے کے لیے بے چین ہوں اور اپنی خواہش پوری کرنے کے بہانے ڈھونڈھ رہے ہوں، ایک جگہ انہیں ایسا موقع ہاتھ آیا تو اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رقم طراز ہوئے: "امام غزالی کے آئندہ واقعات کسی قدر سلطنت سے وابستہ ہیں اس لیے مختصر طور پر اس وقت کی ملکی حالات کا لکھنا ضروری ہے"[۱]۔ شبلی نے تاریخ نویسی کا یہ بہانہ ڈھونڈھ تو نکالا لیکن تاریخ اور ان کا ساتھ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا انھیں جلد ہی امام غزالی کی علمیت کے آگے ہتھیار ڈال دینا پڑے۔ ۲۹۲ صفحات کی اس تصنیف کا پہلا حصہ جو امام غزالی کے سوانحی حالات کے لیے مخصوص ہے کل ضخامت کے ایک بٹہ سات حصے سے بھی کم یعنی صرف ۲۸ صفحوں پر مشتمل ہے۔ اس حصے کی بھی تاریخی لحاظ سے کوئی خاص اہمیت نہیں۔ کہیں کہیں جہاں تبرکاً شبلی نے تاریخ کا ذکر کیا ہے وہاں اُن کے وہی اصول اور قاعدے کار فرما نظر آتے ہیں جنہیں شبلی نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ مثلاً کسی بات کو وہ تحقیقی مطالعے اور دلائل کے بغیر نہیں مانتے۔ علامہ سمعانی نے کتاب الانساب میں لکھا ہے کہ غزالہ طوس کے ایک گاؤں کا نام ہے۔ امام صاحب وہاں کے

---

۱ - الغزالی صفحہ ۸

رہنے والے تھے اور اسی مناسبت سے غزالی کہلاتے ہیں ۔ شبلی نے جو یہ پڑھا تو انہیں تحقیق کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ تحقیق کرنے کے بعد علامہ صاحب کے اس بیان کو غلط ٹھیراتے ہوئے کہتے ہیں: ''طوس کے ضلع میں غزالہ کوئی گاؤں نہیں[1] ۔'' یعنی جب اس نام کا کوئی گاؤں ہی نہ تھا تو امام صاحب کے وہاں کے رہنے والے ہونے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ۔

البتہ کہیں کہیں تحقیق پر شبلی کا زور نہ دینا کھٹکتا بھی ہے مثلاً صفحہ ۴۲ اور صفحہ ۴۳ پر امام صاحب کی تصوف سے دلچسپی کی ابتدا کی تاریخوں میں اختلاف ہے، اسی طرح آن کی درباروں سے بے تعلقی کا ذکر دو طرح بیان کیا ہے ۔

لکھنے کا انداز وہی سیدھا سادہ سا ہے ۔ نہ کہیں الٹے سیدھے معمے ہیں نہ کہیں زبان و بیان کی گلکاریاں ۔

صرف ۲۸ صفحوں میں جن میں سے گنتی کے صرف چند ہی صفحوں کو تاریخ سے متعلق کہا جا سکتا ہے ، شبلی فنِ تاریخ نویسی سے کہاں تک فیض اٹھاتے ۔ وہ پوری طرح ان اصولوں کو برت بھی نہ پائے ۔ ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہنے میں جھجک نہیں ہوتی کہ الغزالی کو شبلی کی تاریخی تصانیف میں شامل کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ۔

سوانح مولانا روم :

مولانا سلیمان ندوی لکھتے ہیں : ''جس طرح عقلیات کی تلاش نے مولانا کو امام غزالی کی درس گاہ تک پہنچایا ، امام غزالی کی تلاش ان کو مولانا روم کے آشیانہ تک لے آئی[2] ۔''

---

۱ ۔ الغزالی صفحہ ۲

۲ ۔ حیات شبلی صفحہ ۳۷۷

انغزالی کی تصنیف کے بعد مولانا شبلی نے مولانا روم کی سوانح لکھنی شروع کی جو اگست ۱۹۰۶ع میں شائع ہوئی ۔ اس کی وجہٴ تصنیف بیان کرتے ہوئے شبلی نے لکھا تھا: ''مولانا روم کو دنیا جس حیثیت سے جانتی ہے وہ فقر و تصوف ہے اور اس لحاظ سے متکلمین میں ان کو داخل کرنا اور اس حیثیت سے ان کی سوانح عمری لکھنا لوگوں کو موجب تعجب ہوگا لیکن ہمارے نزدیک اصلی کلام یہی ہے کہ اسلام کے عقائد کی اس طرح تشریح کی جائے اور اس کے حقائق و معارف اس طرح بتائے جائیں کہ خود بخود دل نشیں ہو جائیں ۔ مولانا نے جس خوبی سے اس فرض کو ادا کیا ہے مشکل سے اس کی نظیر مل سکتی ہے ۔ اس لیے ان کو زمرہٴ متکلمین سے خارج کرنا سخت نا انصافی ہے'۱ ۔''

شبلی کا مندرجہ بالا بیان پڑھ کر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اُن کے پیشِ نظر مولانا روم کو بحیثیت متکلم پیش کرنے کا پروگرام ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ سوانح مولانا روم میں شبلی صرف اسی کوشش میں مصروف رہے ہیں کہ متکلم مولانا روم کے چہرے سے نقاب الٹ دی جائے اسی لیے اپنے معمول کے خلاف انھوں نے تاریخ نویسی پر بہت کم دھیان دیا ہے ۔

سوانح مولانا روم بھی الغزالی اور النعمان کی طرح نیم تاریخی اور نیم علمی کتاب ہے ۔ شبلی کا مقصدِ تصنیف و تالیف مسلمانوں کے دل سے احساسِ پستی دور کرنا تھا ۔ ضروری نہیں کہ یہ کام صرف تاریخ لکھ کر ہی کیا جاتا ۔

---

۱ ۔ سوانح مولانا روم صفحہ ۹

اس مقصد تک پہنچنے کے لیے اور بھی راستے تھے ۔ مسلمانوں کے آبا و اجداد کے علمی کارنامے بیان کر کے بھی تو یہ کام ہو سکتا تھا ۔ شبلی تاریخ لکھتے لکھتے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تھک سے گئے تھے اس لیے انھیں اپنا مقصد پانے کے لیے کسی اور راہ کی تلاش ہوئی ۔ چلتے چلتے علمی بزرگوں کی دنیا میں جا پہنچے ۔ لیکن کب تک ؟ وہ تاریخ نویسی کے لیے وقف ہو چکے تھے ۔ اس سے پیچھا چھڑانا چاہتے بھی تو چھڑا نہ سکتے تھے ۔ کہنے کو تو وہ علمی بزرگوں کے مرید بن بیٹھے لیکن جب بھی مورخ شبلی نے انھیں آواز دی وہ لبیک کہتے آ پہنچے ۔ ایک جگہ مولانا روم کا ذکر کرتے کرتے انھیں مورخ شبلی نے آواز دی تو وہ یہ کہتے ہوئے آ گئے : "چونکہ مولانا کے حالات زندگی میں سلاطین روم کا ذکر جا بجا آئے گا اور ان سلاطین میں سے اکثر کو مولانا سے خاص تعلق رہا ہے اس لیے مختصر طور پر اس سلسلے کا ذکر ضروری ہے[۱] ۔" اور جب ذکر چھڑ گیا تو شبلی تاریخ ہی کے ہو رہے لیکن یہاں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انھیں تاریخ کی دنیا میں زبردستی کھینچ کے لایا گیا ہو ۔ نہ اس کتاب میں تاریخ نویسی کے فنی لوازم کی جھلک نظر آتی ہے اور نہ مورخ شبلی کی تڑپ ۔ تعدیل و تحقیق جنھیں شبلی تاریخ نویسی کے اصولوں میں سب سے مقدم جانتے ہیں ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے ان سے دور دور بھاگ رہے ہوں (یہاں میری مراد صرف ان حصوں سے ہے جن پر تاریخ کا گمان ہوتا ہے) مثلاً ایک جگہ ذکر کرتے ہیں کہ ہلاکو خان کے سپہ سالار بائیجو خاں نے

---

۱ - سوانح مولانا روم ، صفحہ ۹ -

قونیہ پر حملہ کیا اور اپنی فوجیں شہر کے چاروں طرف پھیلا دیں - اہلِ شہر محاصرے سے تنگ آ کر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے - آپ نے ایک ٹیلے پر جو بائیجو خاں کے خیمے کے سامنے تھا جا کر مصلیٰ بچھا دیا اور نماز پڑھنی شروع کی - بائیجو خاں کے سپاہیوں نے مولانا کو تاک کر تیر باراں کرنا چاہا لیکن کمانیں کھنچ نہ سکیں - آخر گھوڑے بڑھائے کہ تلوار سے قتل کر دیں لیکن گھوڑے جگہ سے نہ ہل سکے .... لوگوں نے بائیجو خاں سے جا کر یہ واقعہ بیان کیا - اس نے خود خیمے سے نکل کر کئی تیر چلائے لیکن سب پھٹ کر اِدھر اُدھر نکل گئے - جھلا کر گھوڑے سے اتر پڑا اور مولانا کی طرف چلا لیکن ہاتھ پاؤں نہ اٹھ سکے - آخر محاصرہ چھوڑ کر چلا گیا[1] -"

مندرجہ بالا واقعے کو جانے کیوں صحیح ماننے کو جی نہیں چاہتا - ضرورت تھی کہ تحقیق و تدقیق سے اس کی چھان پھٹک کی جاتی - یہ بات علامہ شبلی نے بھی محسوس کی لیکن وہ جرح اور تحقیق کی کاوش میں مبتلا نہیں ہونا چاہتے تھے اس لیے صرف یہ کہہ کر ٹال گئے : "مولانا نے جب اطمینان، استقلال اور بے پروائی سے عین بائیجو خاں کے آگے مصلیٰ بچھا کر نماز پڑھنی شروع کی ہو گی اور اہلِ فوج کی تیر باراں کا کچھ خیال نہ کیا ہو گا، اس نے خود بائیجو خاں کے دل کو مرعوب کر دیا ہو گا[2] -"

شبلی نے اپنی دوسری تصانیف کی طرح کتاب کی خشکی اور

---

۱ - سوانح مولانا روم ، صفحہ ۳۱

۲ - ایضاً صفحہ ۳۲

بے کیفی دور کرنے کے لیے سوانح مولانا روم میں بھی جا بجا دلچسپ قصے بیان کیے ہیں اور مولانا روم کی عظمت کی داستانیں بھی اِدھر اُدھر بکھیری ہیں لیکن ان باتوں کو کسی تاریخی کتاب کی عظمت کی نشانی نہیں کہا جا سکتا۔ بلاشبہ ادبیت کے لحاظ سے سوانح مولانا روم ایک بلند پایہ کتاب ہے لیکن تاریخی حیثیت سے اس کا مرتبہ الغزالی سے کچھ زیادہ بلند نہیں۔

اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر:

یہ باب شبلی کی لکھی ہوئی سوانح عمریوں کے لیے مخصوص ہے۔ گو کہ ''اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر'' اورنگ زیب کا سوانحی خاکہ نہیں لیکن وہ اس کی زندگی کے ایک اہم حصے پر محیط ہے اس لیے اسے سوانح عمریوں کے لیے مخصوص اس باب میں شامل کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں معلوم ہوتا۔

شبلی کی یہ تصنیف ۱۹۰۹ع کی ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوچکا ہے ہندوستان میں انگریز مورخوں نے سیاسی اغراض کے پیشِ نظر مسلمانوں کو تختۂ مشق بنانا اپنی سب سے بڑی عبادت سمجھ لیا تھا۔ ان کے اس رویے سے مسلمانوں میں بے چینی اور پستی کا تصور مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ شبلی کو اس پستی کے دور کرنے کی راہ ناموران اسلام کی عظمت کی داستانیں بیان کرنے میں نظر آئی۔ اس کے ساتھ ہی ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مسلمانوں کی عظمت کے گیت گانے کے ساتھ ساتھ اگر ان پر لگائے جانے والے الزاموں کا جواب بھی دیا جائے تو کیا حرج ہے، یہی سوچ کر شبلی نے ''اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر'' کی داغ بیل ڈالی۔

بقول شبلی : ''اسلامی دنیا میں اورنگ زیب کے بعد اس کے برابر کا کوئی شخص آج تک پیدا نہیں ہوا[1] -'' انگریز بھی اس بات سے خوب آشنا تھے - اس لیے انھوں نے ہندوستانی حکمرانوں میں سب سے زیادہ اسے ہی تختۂ مشق بنایا اور ان واقعات کو جنھیں اورنگ زیب کے لیے باعثِ فخر سمجھا جاتا تھا ایسے رنگ میں پیش کیا کہ وہی واقعات اس کے لیے باعثِ رسوائی معلوم ہونے لگے -

اورنگ زیب پر لگائے جانے والے بےشمار الزاموں میں سے ایک اہم الزام یہ تھا کہ اس نے تختِ سلطنت پر بیٹھتے ہی ہندوؤں کو سرکاری ملازمتوں سے بر طرف کر دیا -

اس شرمناک الزام کے جواب میں مولانا شبلی نے ایسے ہندوؤں کی ایک طویل فہرست[2] ''اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر'' میں دی ہے جو عالمگیر کے عہدِ حکومت میں اہم عہدوں پر فائز تھے - بقول ان کے اس فہرست کے علاوہ سیکڑوں غیر اہم عہدوں پر ایسے ملازمین بھی تھے جن کا ذکر نہیں کیا گیا[3] -''

اس فہرست کو دیکھنے کے بعد یورپی مورخوں کے گھڑے ہوئے اس بے بنیاد الزام کی جو وقعت رہ جاتی ہے اس کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں -

عالمگیر پر لگائے جانے والے دوسرے الزاموں میں ایک اور الزام یہ تھا کہ اس نے امن و امان کی حالت میں بھی کئی بت خانے گرا دیے - شبلی نے اس کے جواب میں باقاعدہ پہلے

---

۱ - اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ، صفحہ ۱۲۸

۲ - ایضاً ، صفحہ ۶۵ــــ۶۴

۳ - ایضاً ، صفحہ ۶۳

تو یہ بتایا کہ بلا وجہ بت خانے گرانا اور پرستش گاہ کو ٹھیس پہنچانا ، نہ کبھی مسلمان کا شیوہ تھا اور نہ اب ہے ، اس کے بعد انھوں نے یہ کہا کہ اورنگ زیب کے زمانے میں بھی ''جس قدر بت خانے توڑے گئے وہ ان ہی مقامات کے تھے جہاں پر زور بغاوتیں ہوئیں ۔ عالمگیر ۲۵ برس تک دکن میں رہا وہاں ہزاروں بت خانے تھے لیکن کسی تاریخ میں بھی نہیں مل سکتا کہ اس نے کسی بت خانے کو ہاتھ لگایا ہو[۱] ۔'' ظاہر ہے اگر وہ دکن کے بتکدوں کو گرائے بغیر رہ سکتا تھا تو اسے دوسری جگہوں کے بتخانوں کے قائم رہنے میں کیا اعتراض ہوتا ؟

جب ان الزامات سے بھی انگریزوں کی تسلی نہ ہوئی تو انھوں نے اورنگ زیب کو ملزم ٹھیرانے کے لیے شور مچایا کہ وہ ایسا ظالم بادشاہ ہے جس کا دامن بھائیوں کے خون کی چھینٹوں سے آلودہ ہونے کے علاوہ اپنے باپ کے قید میں ٹپکنے والے آنسوؤں سے بھی تر ہے ۔ شبلی نے اس الزام کا بھی بالتفصیل جواب دیا ہے اور اپنے اصول کے مطابق حتی الامکان یہ کوشش کی ہے کہ جو کچھ بھی کہیں وہ غیرجانبداری کا مرقع ہو۔ اپنی اس کوشش کا ذکر کرتے ہوئے شاہ جہاں اور اس کے بیٹوں پر اورنگ زیب کے ہاتھوں ہونے والے مظالم کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں : ''ہم کو نہایت ٹھنڈے دل سے بے رو رعایت ان جرائم کی تحقیق کرنی چاہیے اور نہایت احتیاط رکھنی چاہیے کہ میزانِ عدل کا پلہ طرفداری کے رخ پر جھک نہ جائے[۲] ۔''

---

۱ ۔ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ، صفحہ ۷۲—۷۱

۲ ۔ ایضاً صفحہ ۷۵—۷۴

ایک اور جگہ اسی بات کو یوں لکھتے ہیں : ''اسلامی تعلق سے شاہجہاں اور عالمگیر دونوں یکساں واجب‌التعظیم ہیں ۔ میرا دل دکھتا ہے کہ ان میں سے کسی کو ملزم ٹھیراؤں لیکن سچائی اور تاریخ نویسی کا کیا فرض ہے ۔ شاہ جہاں اور عالمگیر دونوں قابلِ ادب ہیں لیکن دونوں سے بڑھ کر بھی ایک چیز ہے ، حق اور راستی ۔ اور مجھ کو اسی اعلیٰ ترین چیز کے سامنے گردن جھکا دینی چاہیے[۱] ۔'' شبلی نے حتی‌الامکان یہ کوشش کی ہے کہ ان کی گردن حق اور راستی کے قدموں میں جھکی رہے لیکن اپنی کوشش کے باوجود وہ پوری طرح غیر جانبدار نہیں رہ سکے ۔ گو کہ انھوں نے مراد اور اورنگ زیب میں ہونے والی خط و کتابت اور اورنگ زیب کے عہد کے مورخین کے بیانات سے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ جہاں تک اورنگ زیب کا اپنے بھائیوں سے برتاؤ کا تعلق تھا وہ اس سلسلے میں قطعی حق بجانب تھا لیکن اپنی کوشش کے باوجود شبلی اورنگ زیب کو ان الزامات سے نہ بچا سکے جو شاہجہان پر ڈھائے جانے والے مظالم کے سلسلے میں اس پر لگائے جاتے ہیں ۔ شاہجہان اور اورنگ زیب دونوں کو انھوں نے واجب‌التعظیم ٹھیرایا ہے لیکن کہیں کہیں یہ تعظیم اور عزت صرف اورنگ زیب کے لیے وقف ہو جاتی ہے ۔ شاہجہان اور اورنگ زیب میں موازنے کی نوبت آ جائے تو شبلی کی غیر جانبداری دم توڑتی محسوس ہوتی ہے ۔

یہ بات شبلی بھی مانتے ہیں کہ اورنگ زیب میں ہر انسان کی طرح کچھ خامیاں ضرور تھیں لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ

---

۱ ۔ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ، صفحہ ۸۴

وہ اتنا برا نہ تھا جتنا اسے مغربی مؤرخوں نے بنا دیا'۔ بقول ان کے یورپی مؤرخوں کو واقعات بگاڑ کر پیش کرنے میں کمال حاصل ہے۔ انھوں نے عالمگیر کو برے رنگ میں صرف تعصب کی وجہ سے پیش کیا اس لیے ان کے الزامات میں گہرائی اور گیرائی نہیں ملتی۔ شبلی نے اس بات کو مفصل بحثوں سے ثابت کیا ہے کہ مغربی مورخین کس طرح واقعے کی اصلی شکل بدل کر اسے اپنے مطلب کے قالب میں ڈھال لیتے ہیں۔ ان کی اس بے ایمانی اور پست ذہنیت کو دیکھ کر شبلی غصے میں آجاتے ہیں اور اس غصے کا اظہار کبھی کبھی چند سخت جملوں کی شکل میں بھی ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ فرمائیے دو جملے۔ جب یورپی مورخین نے یہ کہا کہ اورنگ زیب نے سیوا جی سے اس کی گرفتاری کے بعد جو برتاؤ کیا وہ اس کے شایانِ شان نہیں تھا تو شبلی کو غصہ آ گیا اور وہ کہہ اٹھے: ''کیا ہمارے یورپین دوست یہ چاہتے ہیں کہ ایک مفتوح باغی، ایک فاتح حکمران کا ہمسر بنا دیا جاتا[2]؟'' ایک اور جگہ اسی ذکر پر شبلی کا غصہ یوں ٹپکا: ''کیا شاہنشاہِ ہند ایک مفتوح رہزن کے لیے تخت سے اتر آتا؟ بے شبہ یورپ اس قسم کی جھوٹی اور مکارانہ خوشامدوں کی مثالیں پیش کرتا ہے لیکن اسلام سے اس کی توقع نہیں رکھنی چاہیے[3]۔'' شبلی کو بھی اپنے مزاج کی اس تیزی کا احساس ہے وہ بھی سمجھتے ہیں کہ کہیں کہیں وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں، ایک جگہ اس کا

۱۔ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر صفحہ، ۱۰۴ تا ۱۳۸
۲۔ ایضاً صفحہ ۲۸
۳۔ ایضاً صفحہ ۲۹

اعتراف آنھوں نے یوں کیا ہے : ”یورپی مورخوں کے اعتراضات اگرچہ نہایت پادر ہوا ہوتے ہیں اور اس لیے ان کا جواب دینا نہایت آسان بات ہے لیکن ...... مسلسل دروغ بیانی اور اختراعوں کے ہجوم پر بے اختیار طیش آجاتا ہے ...... خود مجھ پر بھی یہی اثر پڑا ہے“[1] - شبلی کی اس تصنیف میں ایک آدھ جگہ یہ خامی پیدا ہو گئی ہے کہ وہ مورخ کے منصب سے ہٹ گئے ورنہ باقی جگہوں پر وہ معتدل مزاج اور ٹھنڈے دل کے آدمی دکھائی دیتے ہیں -

شبلی نے اپنے دوسرے ہیروؤں (Heroes) کی طرح اورنگ زیب کو بھی اسلامی عینک لگا کر دیکھنے کی کوشش کی ہے ، چنانچہ انھیں کسی جگہ ذرا سی بھی اسلام کی سن گن ملتی ہے تو وہ کھل اٹھتے ہیں - اورنگ زیب نے ۱۰۶۹ھ میں سنہ شمسی کو جو پارسیوں کی تقلید سے قائم کیا گیا تھا قمری سنہ سے بدل دیا تو شبلی خوشی میں چیخ آٹھے : ”یہ اگرچہ بظاہر معمولی سی بات ہے لیکن اسی قسم کی معمولی باتوں سے دنیا میں سیکڑوں قومیں بنیں اور فنا ہو گئیں“-[2]

شبلی کی تاریخ نگاری ایک مقصد کی خاطر شروع ہوئی تھی- اس مقصد کو پانے کی جستجو میں شبلی برابر رہتے ہیں - چنانچہ جہاں ”اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر“ میں انھوں نے عالمگیر کے بارے میں پھیلائی جانے والی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی سعی کی وہاں انھوں نے اورنگ زیب کی عظمت کے دو بول سنانا بھی ضروری سمجھے - ان کا کہنا تھا : ”اس بات پر قناعت کرنا کافی نہیں ہے کہ عالمگیر کی تحسین چاہے نہ ہو وہ نفرین

---

۱ - اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ، صفحہ ۳۶

۲ - ایضاً صفحہ ۱۱۸

سے بچ جائے بلکہ اس کی خوبیاں گننا بھی نہایت ضروری ہیں'۔"
اس سلسلے میں شبلی نے ایسے کئی قصے سنائے ہیں جنہیں پڑھ کر اورنگ زیب کی عظمت کا اعتراف اس کے دشمنوں کو بھی کرنا پڑتا ہے۔

شبلی کی یہ تصنیف بلا شبہ ان کی بہترین تصانیف میں سے ایک ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے مورخ شبلی کے چال چلن دیکھنے ہوں تو آدمی ان کے ساتھ کچھ وقت اورنگ زیب کے دربار میں گزارے۔ اس دربار میں اس کی ملاقات محقق، سچائی پسند، سادگی کے دلدادہ اور حقیقت پسند شبلی سے ہوتی ہے جس کی جھلکیاں "اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر" میں جا بجا دکھائی دیتی ہیں۔

سیرت النبی :

شبلی کی تصانیف میں حرفِ آخر "سیرت النبی" ہے وہ اسے اپنے لیے وسیلۂ نجات سمجھتے تھے۔ آج تک سیرۃ النبی سے زیادہ محققانہ، عمدہ اور جامع المعلومات کتاب رسول کریمؐ پر نہیں لکھی گئی۔ کتنی حیرت اور خوشی کی بات ہے کہ یہ کارنامہ ایک ہندی نژاد راجپوت کے ہاتھوں انجام پایا[۲]۔

۱۔ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر، صفحہ ۱۰۴

۲۔ شبلی سے چودہ پشت پہلے ان کے آباء و اجداد ہندو راجپوت تھے۔ ایک دن ان کے ایک بزرگ ٹھاکر شوراج سنگھ میلوں کی مسافت طے کر کے گھر پہنچے، تھکے ہوئے تھے، جوتوں سمیت کھانا کھانے چوکے پر بیٹھ گئے۔ ان کی بھاوج نے جو یہ دیکھا تو بولی: "کیا نرے ترک ہی ہوگئے جوتے پہنے چوکے میں چلے آئے اور سارا کھانا بھرشٹ کر ڈالا۔ شوراج یہ طعنہ

بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر

شبلی کی تصنیفی زندگی کی ابتدا ایک مولوی کے رنگ میں ہوئی تھی - یہی زمانہ ہے جب رسول پاکؐ سے ان کی محبت عروج کو پہنچی۔ سرسید کے یہاں جانے کے بعد وہ خاصی حد تک جدید رنگ میں ڈھل گئے تھے۔ وہیں انھیں "ابن الوقت" قسم کے مولویوں سے نفرت پیدا ہوئی اور یہ نفرت بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچی کہ نماز روزے کے پابند ہونے کے باوجود وہ خاصے جدت پسند ہو گئے، ان کے دل میں نئے نئے خیالات نے جگہ پائی جنھیں دیکھتے ہوئے خورشیدالاسلام نے کہا ہے: "اگر شبلی مولوی نہ ہوتے تو خاصے ترقی پسند ہوتے[۱]" - اس ترقی پسندی کے باوجود شبلی کو اسلام سے دلچسپی تمام عمر رہی اور رسول مقبول سے ان کی عقیدت کو آن کی ترقی پسندی کے باوجود کوئی ٹھیس نہ پہنچی - اس بات کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ "علی گڑھ پہنچنے پر ان کی جدید تصنیفی زندگی کا آغاز بھی رسول کریمؐ کی سیرت لکھنے سے ہی ہوا - "وہاں پہنچ کر انھوں نے سب سے پہلے "بدءالاسلام" کے نام سے عربی میں ایک رسالہ لکھا تھا جو علی گڑھ کے نصاب میں شامل تھا[۲]" - بقول شخصے "بدءالاسلام در حقیقت اس تناور درخت (یعنی سیرت النبی) کا ایک ننھا سا تخم تھا جیسے برگد کے درخت کا ہوتا ہے[۳]" -

---

پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ

برداشت نہ کر سکا فوراً بولا: "یہ بات ہے تو میں سچ مچ ترک بن جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر قریب کی مسجد میں گئے اور حلقہ بگوش اسلام ہو گئے - اسلامی نام سراج الدین رکھا گیا۔ عبدالسلام خورشید، شبلی نعمانی صفحہ ۷

۱ - خورشیدالاسلام، تنقیدیں صفحہ ۳۶

۲ - حیات شبلی، صفحہ ۲۰۰

۳ - مقتدیٰ خان شروانی، مقالات یوم شبلی صفحہ ۱۱

بدءالاسلام لکھنے کو تو شبلی نے لکھ دی تھی لیکن اس کے لکھنے کے باوجود وہ اپنے آپ کو رسول اللہ کا قرض دار پاتے تھے چنانچہ "انہوں نے جب ناموران اسلام کا سلسلہ چھیڑا تو بار بار ان کے اور دوسروں کے دل میں خیال آیا کہ اِن ناموروں سے پہلے اُس نامور کا نام لینا چاہیے جس کی ناموری نے ان سب کو نامور بنایا اس لیے الفاروق و الغزالی کے بعد ۲۸ ربیع الاول ۱۳۲۱ ہجری مطابق ۵ جون ۱۹۰۳ ع کو انہوں نے حیدر آباد کے قیام کے زمانے میں اس کام کا آغاز کیا اور ۳ ہجری تک کے واقعات قلم بند کیے - مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس انداز سے وہ اس کو لکھ رہے تھے وہ خود ان کو پسند نہیں آ رہا تھا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہمیشہ اس راز کو محفوظ رکھا اور سارے مکتوبات میں کہیں ایک حرف بھی اس کے متعلق انہوں نے اپنے دوستوں میں سے کسی سے نہیں کہا[۱]"۔

"اس زمانے میں سیرت کے جو اوراق انہوں نے لکھے ان کو ۱۹۱۳ع والے اوراق سے ملا کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی کتاب صرف دماغ سے اور دوسری دل سے لکھی گئی[۲]" -

"بدءالاسلام" اور ۱۹۰۳ع میں لکھے جانے والے اوراق اس بات کے شاہد ہیں کہ شبلی کے دل میں نبیؐ کریمؐ کی سیرت پر لکھنے کو لاوا ایک زمانے سے ابل رہا تھا اور اسے صرف اشارے کی ضرورت تھی - ۱۹۰۶ع میں مولانا محمد علی جوہر

---

۱ - حیات شبلی، صفحہ ۴۰۰

۲ - ایضاً صفحہ ۴۰۳

نے شبلی کو اپنے پاس بڑودہ مدعو کیا۔ وہیں انھوں نے تالیفِ سیرت پر زور دیا اور مولانا شبلی سے وعدہ لے لیا[۱]"۔

شبلی نے مولانا محمد علی سے وعدہ تو کر لیا تھا لیکن لکھتے میں اس لیے جھجکتے تھے کہ "کہیں آنحضرتؐ کے واقعات میں ایک حرف بھی صحت کے معیار سے اتر نہ جائے کیونکہ یہ ایک سخت جرم ہے[۲]"۔

اس تامل کے باوجود آخر کار شبلی سیرت لکھنے پر مجبور ہو گئے کیونکہ ان کے نزدیک اس کی ضرورت "اس لیے اور بڑھ گئی کہ اردو میں سیرت پر کوئی مستند کتاب نہ تھی اس لیے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو سیرت پر کچھ جاننے کے لیے انگریزی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا جو تعصب، رنگ آمیزی اور ناواقفیت کی وجہ سے غلطیوں سے پر تھیں[۳]"۔ چنانچہ ۱۹۱۲ع میں شبلی نے سیرت لکھنے کی طرف اپنی توجہ مبذول کی اور "الندوہ" میں انھوں نے سیرت کی تالیف کا اعلان کرتے ہوئے تجویز پیش کی کہ "مجلسِ تالیفِ سیرتِ نبوی" کے نام سے ایک مجلس بنائی جائے جس کے اراکین سے سیرت کی تصنیف کے لیے ضروری اخراجات پورے کرنے کی درخواست کی جائے[۴]"۔ اس کے بعد مولانا نے سیرۃ نبوی کا دفتر قائم کیا جس میں ایک عربی مددگار اور دو انگریزی کے

۱ - شیخ عطا اللہ، مقالات یوم شبلی صفحہ ۲۲۶
۲ - ایضاً صفحہ ۲۲۷
۳ - ایضاً صفحہ ۲۲۶
۴ - ایضاً صفحہ ۲۰۵

مترجم رکھے[1]" - مولانا خود انگریزی نہ جانتے تھے اس لیے مترجموں کے ذمے رسول کریمؐ پر لکھی جانے والی تصانیف کا ترجمہ کرنا قرار پایا کیونکہ مولانا اروپائی مصنفوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا جواب دینا نہایت ضروری سمجھتے تھے -

شبلی نے سیرت کی تصنیف شروع کی تو اسی کے ہو رہے حتٰی کہ دم نزع بھی جو لفظ ان کی زبان پر تھا وہ تھا "سیرت[2]" -

انھوں نے سیرت کی تصنیف میں جس محنت اور جستجو سے کام لیا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ہفتوں میں صرف دو یا تین صفحے سیرت کے لکھتے تھے ، باقی وقت لکھنے کے لیے سوچ و بچار اور تحقیق و تدقیق میں گزرتا تھا - اس بات کا اظہار انھوں نے خود بھی ایک خط میں کیا ہے ، لکھتے ہیں : "سیرت میں نہایت تنقید اور جاں فشانی سے کام لے رہا ہوں ، اس لیے ہفتوں میں دو تین صفحے کا سامان ہاتھ آتا ہے[3]" -

یقیناً اغلاط سے پاک سیرت لکھنے کے لیے اسی تلاش و جستجو کی ضرورت تھی - لیکن یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ چیز چاہے اچھی ہو یا بری اس کا ضرورت سے بڑھا ہوا استعمال ہمیشہ نقصان دہ ہوتا ہے -"سیرت النبی" پڑھتے پڑھتے کہیں کہیں اس صداقت پر ایمان لے آنے کو جی چاہتا ہے ، اس لیے کہ لکھتے لکھتے کبھی کبھی شبلی، تاریخ نویسی کے اصول پورے

---

۱ - حیات شبلی صفحہ ۲۰۷

۲ - ایضاً صفحہ ۵۱

۳ - خط نمبر ۷۶ بنام مہدی افادی ، مکاتیب شبلی جلد دوم صفحہ ۲۳۲

کرنے میں اس حد تک کھو جاتے ہیں کہ ان کا استدلال کھلنے لگتا ہے کیونکہ بعض بعض جگہ جہاں تحقیق و دلائل کی ضرورت نہیں ہوتی وہ وہاں بھی ان کی اہمیت منوانے پر تلے رہتے ہیں -

شبلی کی پر مقصد تاریخ نویسی کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ ناموران اسلام کی عظمت کی داستانیں سنا کر مسلمانوں کی ڈھارس بندھائیں - ظاہر ہے یہ مقصد جس عمدگی سے رسول کریم کی سیرت پر لکھنے سے پورا ہو سکتا تھا اور کسی طرح پورا نہ ہوتا - رسول اللہ کی تو پوری زندگی ہی عظمت کی داستانوں کا مجموعہ ہے ، پھر یہ کیسے ہوتا کہ ان کی داستان حیات کہی جاتی اور کتاب کا کوئی بھی صفحہ ان کی عظمت کے بیان سے خالی رہتا - جگہ جگہ شبلی نے ان کی عظمت کی داستانیں بکھیری ہیں جو اسلام اور پیغمبر اسلام کی منہ بولتی تصویریں ہیں -

محبت کی شدت انسان کو شعر و شاعری کی دنیا میں لے جاتی ہے - یوں تو شبلی نے جتنے لوگوں کی بھی سوانح لکھیں وہ ان سب ہی کے عقیدت مند تھے لیکن یہ عقیدت اور محبت جس عروج پر "سیرۃ النبی" میں ہے شاید کہیں اور نہیں - اسی محبت کے ہاتھوں کتاب میں جگہ جگہ شعریت پیدا ہو گئی ہے لیکن ایسا کہیں نہیں ہوا کہ شاعر شبلی نے اپنی شاعری کی خاطر مورخ و محقق شبلی کو پچھاڑ کر مورخانہ تقاضے پورے کرنے سے روکا ہو - اس سلسلے کی ایک مثال پہلے بیان ہو چکی ہے ایک اور ملاحظہ فرمائیے ، انشا پرداز شبلی برسرکار ہیں - رسول اللہ کے خطبۂ فتح مکہ کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں :

"خطبہ کے بعد آپ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جباران قریش سامنے تھے ان میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں سب کے پیشرو تھے . . . . . وہ بھی تھے جن کی

تیغ و سناں نے پیکرِ قدسی کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں، وہ بھی تھے جنھوں نے آنحضرتؐ کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے، وہ بھی تھے جو وعظ کے وقت آنحضرتؐ کی ایڑیوں کو لہولہان کر دیتے تھے، وہ بھی تھے جن کی تشنہ لبی خونِ نبوت کے سوا کسی چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی، وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینے کی دیواروں سے آ آ کر ٹکراتا تھا، وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی ریگ پر لٹا کر ان کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے۔

رحمت عالم نے ان کی طرف دیکھا اور خوف انگیز لہجہ میں پوچھا: "تم کو کچھ معلوم ہے، میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟

یہ لوگ ظالم تھے، شقی تھے، بے رحم تھے لیکن مزاج شناس تھے، پکار اٹھے: "تو شریف بھائی ہے اور شریف برادر زادہ ہے؟"

ارشاد ہوا۔ "تم پر کچھ الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو"۔

کتاب ابتدا سے لے کر انتہا تک تحقیق و تدقیق کے آئینے سے چمکائی گئی ہے، یورپی مورخوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا جواب اس عمدگی سے دیا گیا ہے کہ ان کے لگائے ہوئے بے بنیاد الزامات کی حقیقت واضح ہو گئی ہے۔ یہاں ایک مثال کا بیان ضروری معلوم ہوتا ہے ملاحظہ فرمائیے:

رسول کریم پر کثرتِ ازواج کی وجہ سے (نعوذباللہ) مغربی مورخین الٹے سیدھے الزامات لگایا کرتے تھے ان کا جواب دیتے ہوئے شبلی لکھتے ہیں: "رسول اللہ نے ۵۳ برس تک خدیجہ کے سوا، جو شادی کے دن ۴۰ برس کی تھیں کسی سے شادی نہیں کی، یہ شباب کا نہیں بلکہ انحطاط کا زمانہ ہے اس لیے اگر

۱ - سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۵۲۰-۵۱۹

مقصود ہوائے نفس ہوتی تو اس زمانے میں شادیاں کی ہوتیں ، جو شادیاں کیں اکثر پولیٹیکل تھیں یعنی ان کے ذریعے بڑے بڑے عرب قبائل سے اتحاد پیدا ہوا اور ان میں اسلام پھیلا ۔" ظاہر ہے اس بیان کے بعد یورپی مورخین کے اعتراضات کی وقعت کیا رہ جاتی ہے ۔ اسی طرح کی اور بھی کئی مثالیں ہیں جن سے شبلی کی محققانہ حیثیت واضح ہوتی ہے ۔ ان میں سے ایک پیش خدمت ہے :

"خیبر کے واقعات میں ارباب سیر نے ایک سخت غلط روایت نقل کی ہے اور وہ اکثر کتابوں میں منقول ہو کر متداول ہو گئی ہے یعنی یہ کہ اول آپ نے یہود کو اس شرط پر امن عام دیا تھا کہ کوئی چیز نہ چھپائیں گے ، لیکن جب کنانہ بن الربیع نے خزانہ بتانے سے انکار کیا تو آپ نے حضرت زبیر کو حکم دیا کہ سختی کر کے اس سے خزانہ کا پتہ لگائیں ، حضرت زبیر چقماق جلا کر اس کے سینے کو داغتے تھے ، یہاں تک کہ اس کی جان نکلنے کے قریب ہو گئی ۔ بالآخر آپ نے کنانہ کو قتل کرا دیا ، اور تمام یہودی لونڈی غلام بنا لیے گئے ۔

اس روایت کا اس قدر حصہ صحیح ہے کہ کنانہ قتل کر دیا گیا ، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ خزانہ بتانے سے انکار کرتا تھا ، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ کنانہ نے محمود بن مسلمہ کو قتل کیا تھا ، طبری میں تصریح ہے :

ثم دفعہ رسول اللہ الی محمد بن مسلمۃ فضرب عنقہ باخیہ محمود بن مسلمہ صفحہ (۱۵۸۲)

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کنانہ کو محمد بن مسلمہ کے حوالے کیا ، انھوں نے اپنے بھائی محمد بن مسلمہ کے قصاص میں اس کو قتل کر دیا ۔

باقی روایت کا یہ حال ہے کہ یہ روایت طبری اور ابن ہشام دونوں نے ابنِ اسحاق سے روایت کی ہے لیکن ابن اسحاق نے اوپر کے کسی راوی کا نام نہیں بتایا، محدثین نے رجال کی کتابوں میں تصریح کی ہے کہ ابن اسحاق یہودیوں سے مغازی نبوی کے واقعات روایت کرتے تھے، اس روایت کو بھی انہی روایتوں میں سمجھنا چاہیے اور یہی وجہ ہے کہ ابن اسحاق ان راویوں کا نام نہیں لیتے۔

کسی شخص پر خزانہ بتانے کے لیے اس قدر سختی کرنا کہ اس کے سینہ پر چقماق سے آگ جھاڑی جائے، رحمتہ اللعالمین کی شان اس سے بہت ارفع ہے۔

وہی شخص جو اپنے زہر دینے والے سے مطلق تعرض نہیں کرتا، کیا چند سکوں کے لیے کسی کو آگ سے جلانے کا حکم دے سکتا ہے؟

اصل واقعہ اس قدر تھا کہ کنانہ بن ابی الحقیق کو اس شرط پر امان دی گئی تھی کہ کسی قسم کی بد عہدی اور خلاف بیانی نہ کرے گا (بلکہ ایک روایت میں ہے کہ) اس نے یہ منظور کیا تھا کہ اگر اس کے خلاف اس نے کچھ کیا تو وہ قتل کا مستحق ہو گا۔

کنانہ نے بد عہدی کی اور جو امن اس کو دیا گیا تھا ٹوٹ گیا۔ کنانہ نے محمود بن مسلمہ کو قتل کیا تھا، اب اس کے قصاص میں وہ قتل کر دیا گیا جیسا کہ ابھی ہم نے طبری کی روایت سے نقل کیا ہے۔

اب دیکھو اس روایت میں کیا کیا واقعات اضافہ ہو گئے۔

۱۔ قتل کا واقعہ کنانہ کے ساتھ خاص تھا۔ خزانے کے چھپانے کا وہی مجرم تھا۔ محمود ابن مسلمہ کو اسی نے قتل کیا

تھا - اس لئے وہی قتل بھی کیا جا سکتا تھا - اضافہ کا پہلا قدم یہ ہے کہ ابن سعد نے بکر بن عبدالرحمٰن سے جو روایت متصل نقل کی ہے - اس میں کنانہ کے ساتھ اس کے بھائی کا بھی نام بڑھا دیا ہے - یعنی دونوں قتل کیے گئے -

فضرب اعناقهما وسبئى اهليهما	تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو قتل کروایا اور ان کی عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنایا -

۲ - یہاں تک بھی خیریت تھی - لیکن ابن سعد نے عفان بن مسلم سے جو روایت نقل کی ہے وہ اس سے بھی زیادہ وسیع ہو گئی ہے - یعنی دونوں بھائیوں کے ساتھ تمام یہودی گرفتار اور لونڈی غلام بنا لیے گئے -

فلما وجد المال الذی غیبوه فی مسک الجمل مسبلی نساء هم	تو جب وہ خزانہ مل گیا - جس کو انھوں نے اونٹ کی کھال میں چھپا رکھا تھا - تو ان کی عورتیں گرفتار کیں اور لونڈیاں بنالیں -

لیکن جب یہ روائتیں محدثانہ اصولِ تنقید سے جانچی جاتی ہیں تو چھلکے اترتے جاتے ہیں اور اصل حقیقت رہ جاتی ہے - یہود کا قتل اور زن و بچہ کا گرفتار ہونا ایک طرف - خود صحیح بخاری سے ثابت ہے کہ کنانہ کا بھائی تک قتل نہیں کیا گیا اور حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت تک موجود تھا - صحیح بخاری میں ہے :

فلما اجمع عمر على ذٰلک اتاه احد بنی ابی الحقیق فقال یاامیر المومنین اتخرجنا وقداقدنا محمد عاملنا علی الاموال۔

پھر جب حضرت عمر نے یہ ارادہ کر لیا تو ابوالحقیق کا ایک بیٹا ان کے پاس آیا اور کہا کہ امیرالمومنین آپ ہم کو نکالتے ہیں ۔ حالانکہ ہم کو محمد (صلی اللہ علیہ و سلم) نے رہنے دیا تھا اور خراج پر معاملہ کیا تھا ۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں تصریح کی ہے کہ یہ وہی کنانہ بن ابن الحقیق کا بھائی تھا ۔

حافظ ابن قیم نے زادالمعاد میں عام روایتوں کی وسعت کو گھٹا کر اس حد تک پہنچایا کہ

ولم یقتل رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم بعد الصلح الا ابنی ابی الحقیق (ذکر غزوۂ خیبر)

آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے صلح کے بعد ابن الحقیق کے دونوں بیٹوں کے سوا اور کسی کو قتل نہیں کیا ۔

لیکن حافظ موصوف کو اگر صحیح بخاری کی عبارت مذکورہ بالا پیش نظر ہوتی تو غالباً تعداد اور بھی گھٹ جاتی ۔

ابوداؤد میں جہاں ارض خیبر کا عنوان باندھا ہے صرف ابن ابی الحقیق کا قتل کیا جانا لکھا ہے ۔ یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ابو داؤد میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے سعیتہ (حیس بن خطاب کے چچا) سے پوچھا تھا کہ وہ خزانہ کیا ہوا ؟ اس نے کہا لڑائیوں میں صرف ہو گیا باوجود اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے صرف کنانہ کے قتل کا حکم دیا ۔ یہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ کنانہ

کا قتل محمود بن مسلمہ کے قصاص میں ہوا تھا۔ ورنہ اگر خزانے کے چھپانے کا جرم قتل کا سبب ہوتا تو اس جرم کے مجرم اور بھی تھے۔

مورخین نے پہلی غلطی یہ کی کہ کنانہ کے قتل کا سبب اخفائے خزانہ سمجھے اور چونکہ اس جرم میں اور لوگ بھی شریک تھے۔ اس لیے یہ تعمیم خود بخود پیدا ہوگئی کہ کنانہ کا تمام خاندان قتل کر دیا گیا۔

سیرت النبی بھی شبلی کی دوسری تصانیف کی طرح آسان و سادہ زبان میں لکھی گئی ہے جو مورخانہ تصانیف کے لیے نہایت ضروری ہے۔ نہ کہیں بھول بھلیاں ہیں نہ کہیں معمے، جو کچھ کہا ہے نہایت واضح ہے۔

شبلی کا ارادہ کئی حصوں میں سیرت لکھنے کا تھا۔ وہ سیرت سے متعلق ہر موضوع پر لکھنا چاہتے تھے لیکن افسوس عمر نے وفا نہ کی اور شبلی کا لگایا ہوا یہ درخت ان کی زندگی میں پوری طرح پروان نہ چڑھ سکا۔

۱۔ سیرت النبی جلد اول صفحہ ۴۹۴ تا ۴۹۸

شبلی بحیثیت شاعر مورخ

"شاعر شبلی کے حساس دل اور مورخ شبلی کی باریک بیں نظر کے امتزاج نے شبلی کی نظموں کو شعریت اور واقعیت کا حسین مرقع بنا دیا ہے۔ انھوں نے جن نظموں میں تاریخی واقعات کو شعر کا موضوع بنایا ہے، انھیں پڑھتے ہوئے، پڑھنے والا خاص طور پر محسوس کرتا ہے کہ شاعر نے تاریخ نویسی کے تقاضوں کو بے حد اہمیت دینے کے باوجود شعر کے نازک آبگینے کو ٹھیس نہیں پہنچنے دی۔ تاریخ کی اصلیت اپنی جگہ قائم ہے اور شعر کی شعریت اپنی جگہ"۔

شبلی کو قدرت نے مورخ کا ذہن اور شاعر کا دل عطا کیا تھا۔ وہ ہر چیز کو مورخ کی باریک بیں نظر سے دیکھتے اور شاعر کے حساس دل سے محسوس کرتے تھے۔ یوں تو مورخ شبلی کی نثر کے مرقعوں میں بھی کہیں کہیں شاعر شبلی کی جھلک نظر آجاتی ہے لیکن شاعر شبلی کی شاعری میں ہر وقت مورخ شبلی پیش پیش نظر آتے ہیں۔ تاریخ نویس شبلی کی نگاہ کسی چیز کو دیکھتی ہے تو اس کی کسک شاعرِ شبلی کو محسوس ہوتی ہے اور وہ اس کا اثر قبول کرتے ہیں، اس اثر کے بغیر ان کی شاعری، شاعری نہیں رہتی، اس بات کا احساس خود انھیں بھی ہے، چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں: "میں نظم پر باوجود ہزاروں شعر کہنے کے بالکل قادر نہیں، یعنی بغیر کسی خاص فوری تاثر کے ایک حرف نہیں لکھ سکتا[1]"۔

شاعر شبلی کے حساس دل اور مورخ شبلی کی باریک بیں نظر کے امتزاج نے شبلی کی نظموں کو شعریت اور واقعیت کا حسین مرقع بنا دیا ہے۔ شبلی نے جن نظموں میں تاریخی واقعات کو شعر کا موضوع بنایا ہے ان میں تاریخ کے اصولوں کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور شعر کے نازک آبگینے کو بھی

۱۔ خط ۲۸بر بنام عبدالحکیم دسنوی، مکاتیب شبلی جلد اول صفحہ ۳۰۸۔

ٹھیس نہیں پہنچنے دی - تاریخ کی اصلیت اپنی جگہ قائم ہے اور شعر کی شعریت اپنی جگہ - اردو میں نثری تاریخ نویسی کی طرح شعری تاریخ نویسی کی بنیاد رکھنے کا سہرا بھی شبلی کے ہاتھ ہے[۱] -

شبلی سرسید کی تحریک کے ایک مخلص علم بردار تھے، سرسید اور ان کے پیشِ نظر ایک ہی مقاصد تھے، وہ دونوں مسلمانوں کو پستی کی اتھاہ گہرائیوں سے نکالنے کے خواہش مند تھے لیکن اس سلسلے میں دونوں کا اندازِ فکر بھی جدا تھا اور طریقِ عمل بھی -

سرسید اس بات کے حق میں تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کو انگریزوں کے قریب لا کر ان کی ترقی کے لیے راہ ہموار کی جائے اس کے برعکس شبلی انگریزوں سے راہ و رسم بڑھانے کے حق میں نہیں تھے، سرسید مصلحت اندیش تھے، انھیں اس مصلحت کی خاطر انگریز کی تقلید بھی گوارا تھی لیکن شبلی کے سوچنے کا انداز سرسید سے بہت حد تک جدا تھا - انھیں مصلحت سے سروکار نہ تھا، اسلام سے محبت اور سچائی سے پیار تھا - اس میں شک نہیں کہ سرسید نے بھی غدر کے واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے انگریزوں کو کھلم کھلا برا کہا تھا لیکن ایسا کرتے ہوئے موقع محل کا خیال ضرور رکھا تھا - شبلی اس طرح کی مصلحت بینی کے قطعاً خلاف تھے - ان کے مذہبی جذبات انھیں مصلحت سے دور رکھتے تھے - وہ مصلحتاً بھی مذہب پر سیاست کو ترجیح دینے کے قائل نہ تھے -

انگریزوں نے مسلمانوں کی نظر میں ان کے آباء و اجداد

۱- عبداللطیف اعظمی، مولانا شبلی کا مرتبہ اُردو ادب میں صفحہ ۱۸۲

کو گرانے کی کوشش کی تو انھوں نے "سلسلۂ ناموران اسلام" کے نام سے عظیم مسلمان رہنماؤں پر کتابیں لکھ کر مسلمانوں کو ان کے آباء و اجداد کی عظمت کے گیت سنائے، شاعری میں بھی جب شبلی نے تاریخی واقعات پر قلم اٹھایا تو ان کے سامنے اپنی تاریخ نویسی کا یہی مقصد تھا۔ چنانچہ انھوں نے شعر کہتے ہوئے کئی ایسے واقعات نظم کیے ہیں جن سے مسلمانوں کے دل میں ان کے آباء و اجداد کی یاد تازہ ہو جائے، یقیناً اس مقصد کی تکمیل میں شبلی کی نثری، تصانیف نے ایک اہم کارنامہ سر انجام دیا ہے لیکن شبلی سمجھتے تھے کہ دیر پا اور فوری اثر انگیزی کی صلاحیت نثر سے زیادہ نظم میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس مقصد کی تکمیل کے لیے نظم کو اظہار کا ذریعہ بنایا اور زیادہ تر ایسے تاریخی واقعات کو نظم کیا جن میں مسلمانوں کی عظمت کی جھلک نمایاں ہو، مثال کے طور پر دو ایک قصے ملاحظہ فرمائیے۔ حضرت زبیر کی شہادت کا واقعہ شبلی نے اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ سچائی بھی اپنی جگہ قائم ہے اور شاعرانہ تاثیر بھی اپنا کام کر رہی ہے۔ اس قصے سے مسلم مردوں کو تو خیر چھوڑیے، عورتوں ہی کی بہادری کی ایسی مثال سامنے آتی ہے جس کی نظیر مشکل ہی سے کہیں ملے گی:

مسند آرائے خلافت جو ہوئے ابن زبیر
سب نے بیعت کے لیے ہاتھ بڑھائے یک بار

ابن مروان نے حجاج کو بھیجا پئے جنگ
جس کی تقدیر میں مرغان حرم کا تھا شکار

حرمِ کعبہ میں محصور ہوئے ابنِ زبیر
فوج بے دیں نے کیا کعبۂ ملت کا حصار

دامنِ عرش ہوا جاتا تھا آلودۂ گرد
بارشِ سنگ سے اٹھتا تھا جو رہ رہ کے غبار

تھا جو سامانِ رسد چار طرف سے مسدود
ہر گلی کوچہ بنا جاتا تھا اک کنجِ مزار

جب یہ دیکھا کہ کوئی ناصر و یاور نہ رہا
ماں کی خدمت میں گئے ابن زبیر آخر کار

جا کے کی عرض کہ اے اخت حریم نبوی
نظر آتے نہیں اب حرمتِ دیں کے آثار

آپ فرمائیے اب آپ کا ارشاد ہے کیا ؟
کہ میں ہوں آپ کا اک بندۂ فرمانبردار

صلح کر لوں کہ چلا جاؤں حرم سے باہر
یا یہیں رہ کے اسی خاک پہ ہو جاؤں نثار

بولی وہ پردہ نشینِ حرمِ سرِ عفاف
حق پر گر تو ہے تو پھر صلح ہے مستوجبِ عار

یہ زمیں ہے وہی قربان گہِ اسماعیل
فدیۂ نفس ہے خود دینِ خلیلی کا شعار

ماں سے رخصت ہوئے یہ کہہ کے بہ آداب و نیاز
آپ کے دودھ سے شرمندہ نہ ہوں گا زنہار

پہلے ہی حملے میں دشمن کی الٹ دیں فوجیں
جس طرف جاتے تھے یہ ٹوٹتی جاتی تھی قطار

منجنیقوں سے برستے تھے جو پتھر پیہم
ایک پتھر نے کیا آ کے سر و رخ کو فگار

خون ٹپکا جو قدم پر تو کہا از رہِ فخر
یہ ادا وہ ہے کہ ہم ہاشمیوں کا ہے شعار

اس گھرانے نے کبھی پشت پہ کھایا نہیں زخم
خون ٹپکے گا تو ٹپکے گا قدم پر ہر بار

زخم کھا کھا کے لڑے جاتے تھے لیکن کب تک
آخرالامر گرے خاک پہ مجروح و نزار

لاش منگوا کے جو حجاج نے دیکھی تو کہا
اس کو سولی پہ چڑھاؤ کہ یہ تھا قابلِ دار

لاش لٹکی رہی سولی پہ کئی دن ، لیکن
ان کی ماں نے نہ کیا رنج و الم کا اظہار

اتفاقات سے اک دن جو ادھر جا نکلیں
دیکھ کر لاش کو بے ساختہ بولیں یک بار

ہو چکی دیر کہ منبر پہ کھڑا ہے یہ خطیب
اپنے مرکب سے اترتا نہیں اب بھی یہ سوار

یہی واقعہ یوں بھی نظم کیا ہے، اختصار میں بھی ابلاغ کا پہلو نمایاں ہے:

حضرتِ ابنِ زبیر ابن عوام
جب ہوا ان پہ خلافت کا مدار

کی مخالف نے چڑھائی ان پر
گرم تھا موت کا ہر سو بازار

ہو گئے لڑ کے پھر آخر کو شہید
لاش کو ان کی چڑھایا سرِ دار

ان کی ماں نے جو سنی ان کی خبر
دل ہوا ان کا محبت سے فگار

لیکن از بسکہ طبیعت تھی غیور
نہ کیا رنج و الم کا اظہار

اتفاقاً جو ادھر جا نکلیں
کہ وہ موقع تھا سرِ راہ گزار

لاش بیٹے کی جو لٹکی دیکھی
منہ سے بے ساختہ نکلا یک بار

اب بھی منبر سے نہ اترا یہ خطیب
اب بھی گھوڑے سے نہ اترا یہ سوار

شبلی کے بارے میں اکثر کہا جاتا ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے قصیدہ گو ہیں ۔ یہ درست ہے کہ انھوں نے اپنی طبیعت کی مذہبیت اور اپنے مزاج کی مذہب سے مناسبت کی وجہ سے زیادہ تر ایسے واقعات پر قلم اٹھایا ہے جن کا تعلق اسلام اور اس کی حیات افزوں داستانوں سے ہے لیکن وہ ہر وقت اور ہر دم مسلمانوں کی عظمت کی داستانوں میں ہی نہیں کھوئے رہتے بلکہ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ہے، شبلی کے تخلیقی کاموں کی محرک ان کی نزاکتِ احساس ہے ۔ تاریخ کا ہر وہ واقعہ جس میں جذبے کی تڑپ کا کوئی پہلو ہے ، ان کے لیے قابلِ توجہ ہے ، اس سے قطع نظر کہ وہ واقعہ کب کا ہے اور کن سے متعلق ہے ، یہ الگ بات ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ سے متعلق واقعات ان کے دل پر زیادہ گہرا اثر چھوڑتے ہیں ۔

شبلی کا زمانہ ، ہندوستان کیا ، ساری دنیا کے مسلمانوں اور دنیائے اسلام کے لیے بڑی کشمکش کا زمانہ تھا ۔ استعماری قوتیں ہر طرف انہیں اپنے آہنی شکنجے میں کس رہی تھیں اور دنیا کے ہر حصے میں اسلامی حکومتیں رو بہ انحطاط تھیں ۔ مسلمانوں کے لیے یہ بڑی بے بسی کا زمانہ تھا ، اقتدار ان کے ہاتھ میں نہ تھا ، بازو شل تھے اور زبانیں گنگ ۔ شبلی نے ان حالات سے متاثر ہو کر اس دوران میں ہندوستان اور دنیائے اسلام کے مسائل پر کئی نظمیں لکھیں جو اس عہد کے خارجی واقعات اور داخلی کیفیات کی صحیح ترجمان ہیں ۔

اقتدار کی کنجی انگریز کے ہاتھ میں تھی ، وہ ہر بات کو اپنے مطلب کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرتا تھا ۔ حساس شبلی کے لیے یہ بات ناقابل برداشت تھی ۔ متعصب انگریزوں نے ہر بات کو اپنے رنگ میں پیش کر کے اسلام اور دنیائے اسلام کے خلاف نعرے بلند کیے تو شبلی ڈھال بن کر سامنے آگئے اور انھوں نے ان الزامات کو اسلامی نقطۂ نظر سے واضح کر کے سچ اور جھوٹ میں تمیز پیدا کر دی ۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں کان پور کی مسجد کا واقعہ بڑا سخت اور بے حد نازک واقعہ تھا ۔ انگریزی اقتدار کی تاریخ ہمارے سامنے ہے ، وہ ہندوستان میں تاجر کی حیثیت سے آئے تھے لیکن ملک گیری کی ہوس نے طرح طرح کے جال پھیلائے اور بالآخر انگریز سارے ہندوستان کے مقتدرِ اعلیٰ بن بیٹھے ۔

عیسائیت کا پرچار اس سے بھی پہلے شروع ہو چکا تھا اب اس میں اور شدت آگئی ۔ جگہ جگہ عیسائی مشن قائم ہوئے اور نہایت تیزی سے ہندوستانی عوام کو عیسائی بنایا جانے لگا ۔ ہندو اور مسلمان دونوں انگریزوں کی اس روش سے ناخوش تھے ، یہ خفگی بڑھتی رہی اور نفرت کا لاوا اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتا رہا ، حتیٰ کہ ۱۸۵۷ع میں یہ آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑا ۔ انگریزوں نے مقامی فوجیوں کو لڑنے کے لیے ایسے کارتوس دیے جن کا خول بعض روایتوں کے مطابق گائے اور سور کی چربی سے بنایا جاتا تھا ۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے اسے اپنے مذہب پر حملہ تصور کیا اور انھوں نے دوسری وجوہات کے ساتھ ساتھ اس واقعے سے بھی اثر قبول کر کے علمِ بغاوت بلند کیا لیکن بد قسمتی سے

شکست کھائی ۔ اب انگریز بلا شرکتِ غیرے ہندوستان کے مالک تھے ۔ قوانین ان کی مرضی اور مصلحت کے مطابق بننے لگے ۔ وہ جو چاہتے کرتے تھے ، نہ کوئی روکنے والا تھا ، نہ ٹوکنے والا ۔

۱۹۱۲ء کا واقعہ ہے ، کان پور کے محلے مچھلی بازار میں ایک مسجد کے قریب سے ایک نئی سڑک نکالنے کے لیے حکام نے مسجد کا ایک حصہ منہدم کر دیا ۔ اس واقعے سے مسلمانوں میں جوشِ اسلامی کا شعلہ بھڑک اٹھا ۔ انھوں نے ۳ مئی کو مل کر شہر میں ایک جلسہ منعقد کیا اور جلسے کے بعد شرکائے جلسہ نے مسجد کی راہ لی جہاں پہنچ کر انھوں نے دیوار چننی شروع کر دی ۔ حکام نے نہایت بے رحمی سے ان نہتے مسلمانوں پر گولیاں چلائیں جس کے نتیجے میں ان گنت لوگ شہید ہو گئے ۔ اس خونیں حادثے کی وجہ سے پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی آگ اور تیزی سے پھیل گئی ۔ شبلی پر بھی اس واقعے کا گہرا اثر ہوا ۔ یہ اثر شبلی کی زبان سے اشعار کے سانچے میں ڈھل کر یوں سامنے آیا :

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے
دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں

کچھ طفلِ خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں

آئے تھے اس لیے کہ بنائیں خدا کا گھر
نیند آگئی ہے ، منتظرِ نفخِ صور ہیں

کچھ نوجواں ہیں ، بے خبر نشۂ شباب
ظاہر میں گرچہ صاحبِ عقل و شعور ہیں

کچھ پیرِ کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا
جو خاک و خوں میں بھی ہمہ تن غرقِ نور ہیں

پوچھا جو میں نے کون ہو تم ؟ آئی یہ صدا
ہم کشتگانِ معرکۂ کان پور ہیں

ایک دوسری جگہ اس دل سوز واقعے کا ذکر اس طرح کیا ہے :

ہم غریبوں کو نہ پہلے تھا نہ اب ہے انکار
کہ ہر اک شہر میں ہے آپ کے انصاف کی دھوم

آپ قانون کی حد سے نہ بڑھے یک سرِ مو
فیر[1] کا حکم دیا آپ نے جب بہرِ ہجوم

یہ حقیقت بھی مگر قابلِ انکار نہیں
کہ بیک چشمِ زدن موت کو تھا اذنِ عموم

پا بہ زنجیر تھے مجرم بھی تماشائی بھی
اور پولیس کو تھا عذر کہ ہم ہیں محکوم

ہندوستان کے علاوہ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی مسلمانوں پر جو ظلم ڈھائے گئے وہ تاریخی حقیقت ہیں ،

Fire - ۱

شبلی نے ان میں سے بعض کو کان پور کے خونیں حادثے کا مماثل قرار دے کر بڑے درد بھرے انداز میں ان کا ذکر ایک ہی سانس میں کیا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں :

کیا پوچھتے ہو یہ کہ رسولِ عرب کی قوم
کیوں گھٹ رہی ہے آج عدد میں ظہور میں

سن لو وہ گنجہائے گرانمایہ دفن ہیں
کچھ بیلقاں کی خاک میں کچھ کان پور میں

اگرچہ آنکھ میں نم بھی نہیں ہے اب باقی
اگرچہ صدمۂ بلقان سے جگر شق ہے

بچا رکھے ہیں مگر میں نے چند قطرۂ خون
کہ کان پور کے بھی زخمیوں کا کچھ حق ہے

شبلی کے ان اشعار سے اس ہمدردی کا اظہار ہو رہا ہے جو انھیں شہیدانِ کان پور سے ہے، ان میں درد مندی اور گداز بھی ہے اور تندی و تلخی بھی لیکن انھوں نے کہیں شاعری کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے حق کی راہ سے ہٹنا گوارا نہ کیا۔

ایک طرف ہندوستان میں کان پور کی زمین پر مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی اور دوسری طرف جنگ بلقان میں مسلمان مظالم کا نشانہ بن رہے تھے۔ شبلی کا خلوص اور ان کی محبت و درد مندی صرف ہندوستان کے

مسلمانوں تک محدود نہ تھی ، وہ اس وقت بھی تڑپ اٹھتے تھے جب ان کے ہم وطنوں کے خون سے ہاتھ دھوئے جا رہے ہوں اور اس وقت بھی جب دنیا کے کسی دوسرے حصے میں مسلمانوں پر مظالم ڈھائے جا رہے ہوں ۔ شبلی مورخ ہیں اور ان کی نظر بلقان پر بھی اسی طرح پڑتی ہے جیسے کان پور پر ۔ چنانچہ بلقان کے تاریخی واقعات کا جو اثر شبلی کے درد مند دل نے قبول کیا اس کی منہ بولتی تصویریں شبلی کی وہ چھ نظمیں ہیں جو انھوں نے جنگ بلقان سے متاثر ہو کر کہیں ۔ ان نظموں میں شبلی نے "اس جنگ کے مختلف پہلوؤں کو ایک مورخ ، ایک صاحب بصیرت سیاستدان اور درد مند مسلمان کی نظر سے دیکھا اور انھیں ایک شاعر کی طرح لفظوں کا لباس پہنایا[1] ۔" وہ انگریزوں سے خفا ہیں ۔ انھیں ترکوں سے محبت ہے کیوں کہ اسلام کے رشتے سے ترک ان کے بھائی ہیں ، ان نظموں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شبلی کا بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح یہی خیال تھا کہ ترکی کی فتح عالم اسلام کی فتح ہے چنانچہ وہ انگریزوں کو مخاطب کر کے بڑے طنزیہ انداز میں کہتے ہیں :

کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کب تک ؟

یہ جوشِ انگیزئ طوفانِ بیداد و بلا تا کے ؟
یہ لطف اندوزئ ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک ؟

---

۱ ۔ سید وقار عظیم ، مقالات یوم شبلی صفحہ ۲۸

یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں تمھاری کھیتیاں کب تک؟

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک؟

کہاں تک لو گے ہم سے انتقامِ فتح ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک؟

آخری شعر میں مورخ شبلی نے ماضی کے آئینے میں حال کی تصویر دکھانے کی کوشش کی ہے ۔ شبلی کو ترکوں سے ہمدردی بلکہ محبت ہے اس لیے وہ کسی کو ان کی مدد کرتا دیکھ کر جھوم اٹھتے ہیں ، ہندوستانی طبی وفد زخمی ترکوں کی امداد کے لیے بلقان گیا تو شبلی اس کے اراکین سے یوں مخاطب ہوئے :

ہزاروں کوس جا کر بھائیوں کی تم نے خدمت کی
یہی تھا دردِ اسلامی ، یہی تھی رسمِ غم خواری

جو سچ پوچھو تو تم انصار بھی ہو اور مہاجر بھی
کہ سب اہلِ وطن کو چھوڑ کر پہنچے پئے یاری

اور پھر جب ترکوں نے ایڈریا نوپل کے مقام پر فتح پائی تو شبلی کا دل کھل اٹھا :

اے ترک ! اے مجسمۂ کبریائے حق
اے وہ کہ جس پہ عالمِ ہستی کو ناز ہے

پشت و پناہِ ملتِ ختم الامم ہے تو
تو آج زورِ بازوئے شاہِ حجاز ہے

رنگیں ہے تیری تیغ سے ہر صفحۂ وجود
مغرب ترا ہی عرصہ گہِ ترک ناز ہے

تو نے دکھا دیا کہ تری تیغ جانستاں
اب بھی فنائے ہستئ دشمن کا راز ہے

رنگیں جو ہے مرقعِ عالم کا ہر ورق
شمشیر تیری خامۂ رنگیں طراز ہے

ایک مدت سے ہندوستانی مسلمان یہ محسوس کر رہے تھے کہ ایک سیاسی جماعت کے بغیر ہندوؤں اور انگریزوں میں اپنی انفرادیت قائم رکھنا ممکن نہیں - چنانچہ نومبر ۱۹۰۶ع میں ڈھاکہ کے خواجہ سلیم اللہ نے ایک گشتی مراسلے کے ذریعے آل انڈیا مسلم کنفیڈ ریسی کے نام سے ہندوستان میں ایک سیاسی جماعت کے قیام کی تجویز پیش کی تاکہ وہ مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت اور توسیع کے ساتھ ساتھ کانگرس کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کا مقابلہ کرے اور تعلیم یافتہ و ہنر مندمسلمان جوانوں کے لیے عوامی زندگی میں جگہ پیدا کرے - اپنے مراسلے میں خواجہ سلیم اللہ نے مزید لکھا کہ آج تک مسلمان سیاست سے بے اعتنائی برتتے رہے ہیں - ان کی حیثیت محض سیاسی ڈرامے کے تماش بینوں کی سی تھی لیکن اب ان معاملات میں نرمی برتنا ٹھیک نہیں ، اس مراسلے کا اختتام اس خواہش پر ہوا تھا کہ لوگ زیادہ سے زیادہ بڑی تعداد میں اس مسئلے پر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اگلے اجلاس میں غور کریں -

اس کانفرنس کا اگلا سالانہ اجلاس دسمبر ۱۹۰۶ء کے آخری ہفتے میں ڈھاکہ میں منعقد ہوا جس میں تقریباً تین ہزار لوگ شریک ہوئے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا اس سے زیادہ نمائندہ اجلاس اس سے پیشتر کبھی نہ ہوا تھا۔

اپنی زندگی کے بیس برسوں میں یہ پہلا موقع تھا جب کانفرنس نے سیاسی بحثوں پر سے اپنی روایتی پابندی اٹھائی اور نواب سلیم اللہ کی تجویز پر غور کرنے کے لیے دسمبر کی تیرہ تاریخ مقرر کی۔

آخر کچھ بحث و مباحثے کے بعد ایک سیاسی جماعت کے قیام سے متعلق یہ تجویز متفقہ طور پر منظور کر لی گئی، لیکن اس تنظیم کا نام جیسا کہ پہلے تجویز ہوا تھا "کنفیڈریسی" کے بجائے آل انڈیا مسلم لیگ رکھ دیا گیا۔

آل انڈیامسلم لیگ کےقیام کے وقت اس کے مندرجہ ذیل مقاصد قرار دیے گئے تھے۔

(الف) مسلمانانِ ہند کے دل میں برٹش گورنمنٹ کی نسبت وفادارانہ خیالات کو ترقی دینا اورگورنمنٹ کی کسی کاروائی کے متعلق ان میں جو غلط فہمی پیدا ہو اسے دور کرنا۔

(ب) مسلمانانِ ہند کے سیاسی حقوق و فوائد کی نگہداشت کرنا اور ان کی ضروریات و خواہشات کو مؤدبانہ طریقے سے گورنمنٹ میں پیش کرنا۔

(ج) لیگ کے دیگر مقاصد کو نقصان پہنچائے بغیر مسلمانانِ ہند میں ایسے خیالات پیدا نہ ہونے دینا جو دوسرے فرقوں کی نسبت معاندانہ ہوں'۔"

---

1. "In November 1906, Kh. Salim-ullah of Dacca sent round a circular proposing the establishment of a political party, under the name of the All-India Muslim Confederacy for the protection and advancement of muslim interests, combating the growing influence of the Indian National Congress, and encouraging the muslims of talent to enter public life. It added that the community had, thus far, acted as an apparently unconcerned and mute spectator of the Indian Political drama and that had come for open and frank discussions. It ended by asking all those who intended attending the next session of the Mohammadan Educational Conference to come prepared to discuss the scheme at a special sitting.

The annual session of this Conference was held in the last week of 1906 at Dacca. It was attended by some 3000, delegates and was, by common consent, the most representative ever gathering of Muslim India.

Thirtieth of December was the day set apart by the conference to discuss Kh. Salimullah's proposal. For the first time in its 20 years of existance, the conferene lifted its traditional ban on political discussions.

After some discussions the resolution to establish a political party was adopted unanimously and the organisation was named the All India Muslim League, instead of Confederacy as contemplated in the original proposal. Its objects, as formulated by the meeting were :

(a) To inculcate among muslims a feeling of loyalty to the Government and to disabuse their minds of misunderstandings and misconceptions arising out of its action and intentions.

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

ان میں پہلی اور دوسری شق سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ شروع شروع میں حکومت کے بارے میں مسلم لیگ کا رویہ خاصا نرم تھا اور مسلم لیگی اپنی ضروریات و خواہشات کو مود بانہ طریقے سے حکومت کے سامنے پیش کرنے کو اپنے مقاصد میں شامل سمجھتے تھے چنانچہ عوام کی خواہش اور بقول سلیمان ندوی : عام لوگوں کے رجحان کو دیکھ کر لیگ نے ہندوستان کے لیے خود مختار حکومت کا مطالبہ کیا تو اس مطالبے میں سوٹ ایبل (Suitable) کا اضافہ کر دیا یعنی ان کا مقصد ہندوستان کے حالات کے موافق خود مختار حکومت بنانا تھا۔ اس مبہم اور غیر واضح لفظ نے کئی غلط فہمیاں پیدا کر دیں جماعت احرار نے اس کی مخالفت کی اور شبلی نے بھی احراریوں کی رہنمائی میں اس طرز عمل کے خلاف آواز بلند کی'،،۔ مسلم لیگ سے متعلق شبلی کی نظمیں خاص طور پر اہم ہیں کیونکہ یہ لیگ کی داستان حیات ہیں اور انھیں پڑھ کر لیگ کی عمر کے ایک اہم حصے کی تصویر سامنے آ جاتی ہے۔ اس زمانے کی مسلم لیگ کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہی جماعت آگے چل کر مسلمانوں کو آزادی جیسی نعمت اور ایک آزاد ملک

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

(b) To protect and advance the political rights and interests of the Muslims of India and to represent to the Government, from time to time, their needs and aspirations.

(c) To prevent the growth of ill-will between muslims and other nationalities without prejudice to its own purposes." Dr. Abdul Hamid, A Brief Survey of Muslim Separatism in India 1858-1947, P. 78.

۱ - سلیمان ندوی ، کلیات شبلی

دلانے کی خدمت انجام دے گی ۔ بقول ابوالکلام آزاد جہاں اور بہت سے واقعات نے لیگ کو صحیح راہ دکھانے کا کام کیا وہاں شبلی کے اشعار بھی اس کام میں ممد و معاون ثابت ہوئے[۱] ۔ ابتدائی ایام کی مسلم لیگ کا حال شبلی کے اشعار کی زبانی سنئیے:

لیگ کی عظمت و جبروت سے انکار نہیں
ملک میں غلغلہ ہے ، شور ہے ، کہرام بھی ہے

ہے گورنمنٹ کی بھی اس پہ عنایت کی نگاہ
نظرِ لطفِ رئیسانِ خوش انجام بھی ہے

رہنمایانِ نو آموز کا ہے مکتبِ درس
زینۂ فخر و نمائش گریٔ عام بھی ہے

مختصر اس کے فضائل کوئی پوچھے تو یہ ہیں
محسنِ قوم بھی ہے ، خادمِ حکام بھی ہے

جنابِ لیگ سے میں نے کہا کہ اے حضرت
کبھی تو جا کے ہمارا بھی ماجرا کہیے

کلیم طور پر کرتے تھے عرض قوم کا حال
تو آپ شملہ پہ کچھ حال قوم کا کہیے

سنائیے انہیں کچھ بحر قہر و جبر کا حال
پھر اس کے بعد ستم ہائے ناخدا کہیے

۱ - ابوالکلام آزاد ، الہلال ۲۶ فروری ۱۹۱۳ صفحہ ۶

کبھی تو رد و قدح کی بھی کیجیے جرأت
جو بات بات پہ ہر بار مرحبا کہیے

جناب لیگ نے سب کچھ یہ سن کے فرمایا
مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے

حضرتِ لیگ نے اب کی سرِ منبر یہ کہا
کہ بس اب سلف گورنمنٹ کی تیاری ہے

میں نے یہ "سوٹ ایبل" کی جو لگائی ہے قید
یہ عجب نکتۂ آئینِ جہانداری ہے

فنِ انشا و بلاغت کا بھی رکھا ہے لحاظ
کوئی کیا جانے کہ کیا اس میں فسوں کاری ہے

میں نے اس لفظ میں رکھے ہیں ہزاروں پہلو
ایک جملہ ہے مگر لاکھ پہ بھی بھاری ہے

آپ جتنا اسے کھینچیں گے لچک جائے گا
سادگی میں بھی وہی شیوۂ عیاری ہے

اور پھر جب لیگ کے طرزِ عمل میں تھوڑی سی تبدیلی ہوتی محسوس ہوئی تو شبلی کہہ اٹھے :

لوگ کہتے ہیں کہ آمادۂ اصلاح ہے لیگ
یہ اگر سچ ہے تو ہم کو بھی کوئی جنگ نہیں

فرق اتنا تو بظاہر نظر آتا ہے ضرور
اب خوشامد کا ہر اک بات میں وہ رنگ نہیں

آگے تھے حلقۂ تقلید میں جو لوگ اسیر
سست رفتار تو اب بھی ہیں مگر لنگ نہیں

تاریخ نویسی کا ایک اہم اصول ہے کہ ہر بات سیدھے سادے انداز میں بلا کسی لگی لپٹی کے کہہ دی جائے۔ شاعر کو اس کی شاعرانہ تعلیاں مورخ کے منصب سے دور لے جاتی ہیں لیکن شبلی کے یہاں ایسا نہیں ہوتا۔ جیسے وہ ایک واقعے کو نثر میں بیان کرتے ہیں ویسے ہی پوری دیانت داری سے اسے نظم بھی کر لیتے ہیں۔ نہ کہیں بھول بھلیوں میں گم ہوتے ہیں نہ کہیں شاعرانہ تخیلات میں۔ مثال کے طور پر دو ایسے واقعات دیکھیے جنھیں اتفاق سے شبلی نے نثر میں بھی لکھا ہے اور نظم بھی کیا ہے۔

الفاروق میں لکھتے ہیں: "ایک دفعہ حضرت عمرؓ رات کو گشت کے لیے نکلے۔ مدینہ سے تین میل پر صرار ایک مقام ہے، وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک عورت کچھ پکا رہی ہے اور دو تین بچے رو رہے ہیں، پاس جا کر حقیقتِ حال دریافت کی۔ اس نے کہا کہ کئی وقتوں سے بچوں کو کھانا نہیں ملا ہے۔ ان کے بہلانے کے لیے خالی ہانڈی میں پانی ڈال کر چڑھا دی ہے۔ حضرت عمرؓ اسی وقت اٹھے اور مدینہ میں آ کر بیت المال سے آٹا، گوشت، گھی اور کھجوریں لیں اور اسلم سے کہا: "میری پیٹھ پر رکھ دو"۔ اسلم نے کہا: "میں لیے چلتا ہوں۔" فرمایا: "قیامت میں میرا بار تم نہیں اٹھاؤ گے۔ غرض سب چیزیں

خود لاد کر لائے اور عورت کے آگے رکھ دیں ۔ اس نے آٹا گوندھا ہانڈی چڑھائی ۔ حضرت عمرؓ خود چولہا پھونکتے جاتے تھے ۔ کھانا تیار ہوا تو بچوں نے خوب سیر ہو کر کھایا اور اچھلنے کودنے لگے ۔ حضرت عمرؓ دیکھتے اور خوش ہوتے تھے ۔ عورت نے کہا : "خدا تم کو جزائے خیر دے ۔ سچ یہ ہے امیرالمومنین ہونے کے قابل تم ہو نہ کہ عمرؓ[1] ۔"

اسی واقعے کو یوں نظم کیا ہے :

معمول تھا جناب عمرؓ کا کہ متصل
کرتے تھے گشت رات کو سونا محال تھا

اک دن کا واقعہ ہے کہ پہنچے جو دشت میں
کوسوں تلک زمین پہ خیموں کا جال تھا

بچے کئی تھے ایک ضعیفہ کی گود میں
جن میں کوئی بڑا تھا کوئی خرد سال تھا

دیکھا جو اس کو یہ کہ پکاتی ہے کونی چیز
جاتا رہا جو طبع حزیں میں ملال تھا

سمجھے کہ اب وہ ملک کی حالت نہیں رہی
کم ہو چلا ہے قحط کا جو اشتعال تھا

پوچھا خود اس سے جاکے تو رونے لگی کہ آہ
کیا آپ کو غذا کا بھی یاں احتمال تھا

---

۱ ۔ الفاروق صفحہ ۲۳۶

بچے یہ تین دن سے تڑپتے ہیں خاک پر
میں کیا کہوں زبان سے ان کا جو حال تھا

مجبور ہو کے ان کے بہلنے کے واسطے
پانی چڑھا دیا ہے یہ اس کا ابال تھا

ان سے یہ کہہ دیا ہے کہ اب مطمئن رہو
کھانا یہ پک رہا ہے ، اسی کا خیال تھا

بے اختیار رونے لگے حضرتِ عمرؓ
بولے کہ یہ مرے ہی کیے کا وبال تھا

جو کچھ کہ ہے یہ سب ہے مری شامت عمل
از بس گناہ گار مرا بال بال تھا

بازار جا کے لائے سب اسباب آب و ناں
جو زخم قحط کا سببِ اندمال تھا

چولہے کے پاس بیٹھ کے خود پھونکتے تھے آگ
چہرہ تمام آگ کی گرمی سے لال تھا

بچوں نے پیٹ بھر کے جو کھایا تو کھل اٹھے
ایک ایک اب تو فرطِ خوشی سے نہال تھا

تھی وہ زنِ ضعیف سراپا زبانِ شکر
یاں حضرتِ عمرؓ کو وہی انفعال تھا

عہدہ عمرؓ کو یہ جو ملا تجھ سے چھین کر
جو کچھ گزر رہا ہے یہ اس کا وبال تھا

اس واقعے کو نثر اور نظم دونوں میں پڑھنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شبلی نے شاعری میں بھی کہیں حقیقت کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ جو کچھ نثر میں کہا وہی شعر میں بیان کیا۔ تاریخی واقعات کو نظم کرتے وقت نہ تعلیاں ان کا جزوِ ایمان بنیں، نہ مبالغہ آرائیاں۔

ایک اور واقعہ جو شبلی نے نظم و نثر دونوں میں لکھا ہے "عدلِ جہانگیری" سے متعلق ہے۔ نثر میں لکھتے ہیں:

"ایک دفعہ نور جہاں بیگم مہتابی پر ٹہل رہی تھی، اتفاق سے کوئی راہ رو ادھر سے گزرا اور اس نے نظر اٹھا کر نور جہاں کی طرف دیکھا۔ نور جہاں نے اس کو گولی مار دی، جہانگیر کو خبر پہنچی، فوراً حکم دیا کہ تحقیقات کی جائے۔ جرم ثابت ہوا اور قاضی نے قصاص کا فتویٰ دیا۔ قلماقنوں کو حکم ہوا کہ محل میں جا کر نور جہاں کو پکڑ لائیں اور جلاد کے حوالے کر دیں۔ نور جہاں نے بہت کچھ روپیہ کا لالچ دیا لیکن سب جہانگیر کی انصاف پرستی سے واقف تھے، کسی نے کچھ نہ سنی بالآخر نور جہاں نے مقتول کے ورثہ کو راضی کیا کہ خوں بہا لے لیں چنانچہ دو لاکھ روپیہ خوں بہا لے کر ان لوگوں نے دست برداری کی اور جہانگیر سے کہہ دیا کہ ہم کو کچھ دعویٰ نہیں۔ جہانگیر نے کہا: "شاید تم لوگوں پر بیگم کی طرف سے کچھ دباؤ پڑا۔" ان لوگوں نے یقین دلایا کہ نہیں ہم نے بخوشی ایسا کیا ہے۔ جہانگیر نے رہائی کا حکم دیا۔

یہ سب کچھ ہو چکا تو محل میں گیا اور نور جہاں کے پاؤں پر گر کر کہا : "ہائے بیگم اگر ترا می کشتند من چہ می کردم' ۔"

اسی قصے کو شبلی نے شعروں کے سانچے میں یوں ڈھالا ہے :

قصر شاہی میں کہ ممکن نہیں غیروں کا گزر
ایک دن نور جہاں بام پہ تھی جلوہ فگن

کوئی شامت زدہ رہ گیر ادھر آ نکلا
گر چہ تھی قصر میں ہر چار طرف سے قدغن

غیرت حسن سے بیگم نے طپنچہ مارا
خاک پر ڈھیر تھا اک کشتہ بے گور و کفن

ساتھ ہی شاہ جہانگیر کو پہونچی جو خبر
غیظ سے آگئی ابروئے عدالت پہ شکن

حکم بھیجا کہ کنیزانِ شبستانِ شہی
جا کے پوچھ آئیں کہ سچ یا کہ غلط ہے یہ سخن

نخوتِ حسن سے بیگم نے بصد ناز کہا
میری جانب سے کرو عرض بہ آئینِ حسن

ہاں مجھے واقعۂ قتل سے انکار نہیں
مجھ سے ناموسِ حیا نے یہ کہا تھا کہ بزن

اس کی گستاخ نگاہی نے کیا اس کو ہلاک
کشورِ حسن میں جا ری ہے یہی شرع کہن

مفتیٔ دیں سے جہانگیر نے فتویٰ پوچھا
کہ شریعت میں کسی کو نہیں کچھ جائے سخن

مفتیٔ دین نے بے خوف و خطر صاف کہا
شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اڑا دو گردن

لوگ دربار میں اس حکم سے تھرا اٹھے
پر جہانگیر کے ابرو پہ نہ بل تھا نہ شکن

ترکنوں کو یہ دیا حکم کہ اندر جا کر
پہلے بیگم کو کریں بستۂ زنجیر و رسن

پھر اسی طرح اسے کھینچ کے باہر لائیں
اور جلاد کو دیں حکم کہ ہاں تیغ بزن

خدمتِ شاہ میں بیگم نے یہ بھیجا پیغام
خوں بہا بھی تو شریعت میں ہے اک امرِ حسن

مفتی شرع سے پھر شاہ نے فتویٰ پوچھا
بولے جائز ہے، رضا مند ہوں گر بچہ و زن

وارثوں کو جو دیے لاکھ درم بیگم نے
سب نے دربار میں کی عرض کہ اے شاہِ زمن

ہم کو مقتول کا لینا نہیں منظور قصاص
قتل کا حکم جو رک جائے تو ہے مستحسن

ہو چکا جب کہ شہنشاہ کو پورا یہ یقیں
کہ نہیں اس میں کوئی شائبۂ حیلہ و فن

اٹھ کے دربار سے آہستہ چلا سوئے حرم
تھی جہاں نور جہاں معتکف بیت حزن

دفعتہً پانوں پہ بیگم کے گرا اور یہ کہا
تو اگر کشتہ شدی ، آہ چہ می کردم من

اس واقعے کے نثری بیان اور منظوم پیرایۂ اظہار سے واضح طور پر ایک بات جو سامنے آتی ہے ، یہ ہے کہ شبلی نے شاعری کے تقاضے حسنِ بیان کی پابندی کرتے ہوئے بھی تاریخ نویسی کے اہم ترین اصول ، سچائی کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا ۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ نثر میں یہ واقعہ نہایت اختصار اور ایجاز سے لکھا ہے جب کہ شاعری میں یہی آب جو کسی حد تک بحرِ بے کراں ہو گئی ہے ۔ اس لیے کہ یہاں حقیقت میں شاعرانہ احساس اور جذباتی گداز کی آمیزش ضروری تھی ۔

شبلی ، شاعر اور مورخ ہونے کے علاوہ متکلم بھی ہیں ، کبھی کبھی ان میں متکلمین کا جوش عود کر آتا ہے اور یہ چیز جزبۂ غضب پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے ۔ اس کا اعتراف انھیں خود بھی ہے ۔ لیکن شبلی کا یہ غصہ انھیں تاریخ اور شاعری کی دنیا سے زیادہ دور نہیں لے جاتا بلکہ وہ طنز کی

شکل اختیار کر لیتا ہے ، ایسے موقعوں پر ذہن ظفر علی خاں اور اکبر کی سیاسی شاعری کی طرف منتقل ہوتا ہے ۔ جنگِ بلقان کے زمانے میں سر آغا خان نے ایک مضمون میں ترکوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ سر زمینِ یورپ کو چھوڑ کر ایشیا چلے جائیں ۔ اس مشورے پر شبلی کا طنز ملاحظہ فرمائیے :

ترک سے حضرت آغا نے یہ ارشاد کیا
کیوں ہو بے فائدہ یورپ میں گرفتارِ الم ؟

ایشیا میں اگر آجاؤ تو پھر تا بہ ابد
پاؤں پھیلا کے پڑے چین سے سوؤ گے چہ غم ؟

فائدہ کیا ہے کہ تم ریل کا احسان اٹھاؤ
آپ کا اسپ سبک سیر ہے کس بات میں کم ؟

آپ صحرا میں چلائیں گے جو خشکی کا جہاز
پھر نہ کچھ بھاپ کی حاجت ہے ، نہ طوفان کا غم

لمپ کی شعلہ فشانی میں کہاں وہ انداز ؟
شمع کی بزم طرازی کا جو کچھ ہے عالم

پروفیسر سید وقار عظیم نے ایک جگہ مورخ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مورخ کو جب حال میں کچھ نظر آتا ہے تو وہ اسے ماضی کا عکس سمجھتا اور پھر ماضی اور حال کے اس تصور سے مستقبل کا نقش بناتا ہے اور پھر مستقبل کی جھلک دکھا کر اپنے مخاطب کو ایسے راستے پر لانے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے نزدیک سیدھا اور سچا

ہے اور جس پر چلے بغیر آدمی منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ سکتا[۱] ۔" یہ بیان شبلی کی تاریخ نویسی پر خواہ وہ شعر کی شکل میں ہو خواہ نثر کی صورت میں ، پوری طرح صادق آتا ہے کیونکہ شبلی مورخ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دردمند شاعر اور صاحبِ بصیرت سیاستدان بھی ہیں ۔ وہ صرف گزرے ہوئے واقعات سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ آئندہ کے لیے بھی ہدایات جاری کرتے رہتے ہیں اور نیک و بد بھی سمجھاتے جاتے ہیں مثلاً مسلم لیگ نے انگریزوں سے "سلف گورنمنٹ" کا مطالبہ کیا اور اس کے ساتھ "سوٹ ایبل" کی شرط لگائی تو شبلی نے دوسرے صاحبِ بصیرت لوگوں کی طرح "سوٹ ایبل" کی شرط کو لعنت قرار دیتے ہوئے کہا :

لیگ کو جب نظر آیا کہ چلی ہاتھ سے قوم
اک نیا روپ بھرا اس نے بہ انداز دگر

منظر عام پہ لوگوں سے کیا اس نے خطاب
کہ نہیں سلف گورنمنٹ سے اب ہم کو مفر

اک ذرا سی مگر اس لفظ میں تخصیص بھی ہے
جس سے ہیں متفق اللفظ سب اربابِ نظر

یعنی وہ سلف گورنمنٹ کہ ہو سوٹ ایبل
یا کہ موزون و مناسب ہو بالفاظ دگر

جب کبھی کوئی بھی تحریک سیاسی ہو گی
آپ اس قیدِ مناسب کو بنائیں گے سپر

---

۱ ۔ سید وقار عظیم ، مقالات یوم شبلی ، صفحہ ۳۳

یہ وہی لفظ ہے مجموعۂ صد گونہ فریب
یہ وہی لفظ ہے سرمایۂ صد گونہ ضرر

ایک ان میں سے ہے یہ بھی کہ "ابھی وقت نہیں"
ہے اسی لفظ کی تشریح بہ الفاظ دگر

آج یہ لفظ "مناسب" جو نیا وضع ہوا
آپ اسی لفظ کو ہر بار بنائیں گے سپر

آپ اس دام سے برسوں بھی نہ چھوٹیں گے کبھی
آپ اس کوچۂ پر خم سے نہ ہوں گے سربر

آپ اس بھول بھلیاں سے نہ نکلیں گے کبھی
دل سے جائے گا نہ تعلیمِ غلامی کا اثر

شاعری اور تاریخ نویسی کے میدان الگ الگ ہیں ، نہ شاعری تاریخ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر زیادہ دور چل سکتی ہے اور نہ تاریخ دور تک شاعری کا ساتھ دے سکتی ہے - اعلیٰ قسم کی تاریخ صرف وہی ہوتی ہے جس کا تعلق حقائق اور صرف حقائق سے ہو لیکن شاعری کے لیے حقائق میں تخیل کی آمیزش ضروری ہے -

تاریخ نویسی میں اگر تاویلیں آ جائیں تو وہ تاریخ نہیں رہتی لیکن شاعری میں تاویل اپنی جگہ خود بنا لیتی ہے - یہ تاویلیں شاعری کو مبالغے کی سرحد میں لے جاتی ہیں اور یہ مبالغہ شاعری کے حسن میں اضافے کا باعث بنتا ہے لیکن اگر تاریخ میں مبالغہ آ جائے تو وہ تاریخ نہیں رہتی بلکہ افسانہ بن جاتی ہے - مبالغہ آرائی ممکن ہے شاعری کے لیے

حیاتِ جاوداں کا درجہ رکھتی ہو لیکن تاریخ کے لیے یہ بہر طور سم قاتل کے علاوہ اور کچھ نہیں -

تاریخ کے لیے واقعات کا تواتر نہایت ضروری ہے جب کہ شاعری میں تواتر کی کوئی قید نہیں -

اچھی تاریخ نویسی کے لیے تحقیق و تدقیق نہایت ضروری چیزیں ہیں ، تحقیق و تدقیق نثر کے سانچے میں تو ڈھل سکتی ہے لیکن شاعری میں اس کا گزر مشکل ہے -

تاریخ نویسی کے فن کے لیے ضروری ہے کہ مورخ ہر واقعے کو عام نقطۂ نظر کے مطابق بے کم و کاست بیان کر دے ، تاریخ اپنی ذاتی رائے کے اظہار کی اجازت نہیں دیتی - دوسری طرف شاعری کو جذبے کی زبان کہا گیا ہے - یہاں تاریخ کی طرح اہمیت صرف امر واقعہ کے بے کم وکاست اظہار کی نہیں ، اس واقعے کا احساس اور احساس کے جوش میں ڈھلنے کا سوال بھی ہے - یہ فرق بھی تاریخ نویسی اور شاعری کو ایک دوسرے سے الگ لے جاتا ہے -

تاریخ نویسی اور شاعری کے فنون کے اسی فرق کے پیش نظر یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ ان دونوں کا ساتھ ساتھ چلنا گویا ممکن نہیں لیکن شبلی کے یہاں یہ دونوں آمادۂ فساد ہوئے بغیر ایک ہی گھاٹ پر پانی پیتی ہیں - کہیں کہیں البتہ دونوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش ضرور ہوتی ہے - جہاں کہیں ایسا ہوتا ہے شبلی اپنے مؤرخانہ اور شاعرانہ مناصب سے ہٹ جاتے ہیں ، مثلاً کہیں کہیں شاعری میں کوئی تاریخی واقعہ بیان کرتے ہوئے شبلی ، قافیہ ردیف کے قید و بند میں پڑ کر اپنے بیان کو خاصا طویل کر دیتے ہیں ، جب کہ نثر میں وہی واقعہ نہایت اختصار سے بیان ہو جاتا ہے -

کبھی کبھی شبلی جذبات کی دنیا میں بھی کھو جاتے ہیں (میری مراد یہاں صرف شاعری میں بیان کیے جانے والے تاریخی واقعات سے ہے) ۔ نثر انھیں جذبات کی دنیا میں داخل ہونے سے روکتی اور احتیاط کا سبق سکھاتی ہے لیکن شاعری خود بخود اس دنیا میں جانے کے سامان مہیا کر دیتی ہے ۔

نثر میں تو شبلی عام نقطہ ہائے نظر اور دوسرے مورخین کے بیان کو اہمیت دیتے ہیں لیکن شاعری میں وہ کسی کی دخل اندازی گوارا نہیں کرتے اور محض اپنے احساس اور جذبے کی رہنمائی ہی پر بھروسہ کرتے ہیں ۔ اگر شاعری میں تاریخی واقعات بیان کرتے ہوئے شبلی ان خامیوں سے دامن بچا لیتے تو ان کی شاعرانہ تاریخ نویسی بھی نثری تاریخوں کی ہم پلہ بن سکتی تھی ۔

ہم عصر مورخین میں شبلی کا مقام

"شبلی کو اردو کے مورخوں میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ بلا شبہ وہ اُردو کے مورخ اول ہیں اور اولیت کے اس شرف کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ان سب معاصرین میں جنھوں نے تاریخ نویسی کے میدان میں قدم رکھا ہے، نمایاں امتیاز اور انفرادیت کے مالک ہیں۔ وہ اردو کے مورخ اول ہی نہیں تاریخ نگاری کی ایک منزلِ بلند اور اس کا عین مقصود و معیار بھی ہیں۔"

اُردو میں تاریخ نویسی کا ذکر چھڑے تو بات دو چار ناموں سے آگے بڑھانے کو جی نہیں چاہتا کہ ہمارے یہاں فنی اعتبار سے تاریخ نویسی کی روایت کچھ ایسی مستحکم نہیں ، اول تو اردو میں تاریخیں لکھی ہی بہت کم گئی ہیں اور جو لکھی گئی ہیں ان میں سے بھی لے دے کے گنتی کی چند تصانیف کے علاوہ کوئی فنی معیار پر پوری نہیں اترتی ۔ اگر ان مورخوں کی گنتی کی جائے جنھوں نے فن کو فن سمجھ کر پرکھا، برتا اور استعمال کیا ہے تو سب سے پہلے شبلی کا نام ذہن میں آتا ہے ۔ اُنھیں اردو کے مورخوں میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے ۔ اس میں کیا شک ہے کہ وہ اردو کے مورخ اول ہیں اور اولیت کے اس شرف کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ان سب معاصرین میں جنھوں نے تاریخ نگاری کے میدان میں قدم رکھا ہے ، نمایاں امتیاز اور انفرادیت کے مالک ہیں ۔

سرسید احمد خاں شبلی کے ایک نامور تر معاصر ہیں ۔ ان کی ہمہ گیر شخصیت نے ، ہندوستانی سیاست اور یہاں کی علمی ، معاشرتی اور مذہبی سرگرمیوں ، سبھی کو متاثر کیا اور ان سب سے بڑھ کر وہ اردو ادب پر اثر انداز ہوئے ۔ اردو زبان و ادب سے متعلق کسی بھی موضوع کا ذکر چھڑے تان ہر حال میں جا کر انہی پر ٹوٹتی ہے ۔ جہاں اردو زبان ،

شاعری اور تنقید سے متعلق ان کی خدمات بھلائی نہیں جا سکتیں وہاں بحیثیت مورخ بھی انھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ۔

اس سلسلے میں اردو پر سرسید کا یہی احسان کچھ کم نہیں کہ ان کی کوششوں نے اسے شبلی اور ذکاءاللہ جیسے مورخ دیے ۔ لیکن اردو کے مورخین میں ان کا نام صرف اسی ناطے شامل نہیں ۔ انھوں نے خود بھی اردو کو جام جم ، آثارالصنادید ، تاریخ بجنور ، جلاء القلوب بذکرالمحبوب ، خطبات احمدیہ ، اسباب بغاوت ہند اور تاریخ سرکشئی بجنور جیسی تاریخی اہمیت کی حامل کتابیں دی ہیں ۔ ان کے علاوہ "تاریخ فیروز شاہی" اور "آئین اکبری" کی تصحیح بھی سرسید کے تاریخ سے متعلق کارناموں میں شامل ہیں ۔ وہ بلاشبہ ایک بڑے مورخ تھے بلکہ شاید یہ کہنا بھی غلط نہیں ہو گا کہ اگر اردو کے مورخ اول شبلی کو یہ سوچ کر نظر انداز کر دیا جائے کہ ع

"شمار دانۂ تسبیح میں امام نہیں"

تو اردو کے مورخین کی امامت کے فرائض ذکاءاللہ کے ساتھ سرسید کے کندھوں پر بھی آ پڑیں گے ۔

تاریخ نویسی کے ضمن میں سرسید کے کچھ مخصوص نظریات ہیں ۔ وہ انھیں نظریات کی دکھائی ہوئی راہ پر چلتے ہیں ۔

ایک اچھے مورخ کی طرح وہ بھی سادہ انداز تحریر کو تاریخ نگاری کا کمال سمجھتے ہیں ۔ شبلی کی تصنیف "المامون" پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کے سادہ اور سیدھے سادے طرز تحریر کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے :

"باوجود تاریخانہ مضمون ہونے کے ایسی خوبی سے اس کو ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے

اور تاریخانہ اصلیت بھی بدستور اپنی اصلی صورت پر موجود ہے ، جو خوبصورت ہے خوبصورت ہے ، جو بھونڈی ہے بھونڈی ہے ، نہ خوبصورتی کو زیادہ خوبصورت بنایا ہے اور نہ بھونڈے پن کو زیادہ بھونڈا اور دراصل یہی کمال تاریخ نویسی کا ہے[1] ۔"

تاریخ نویسی کے اسی "کمال" کا مظاہرہ سرسید نے اپنی تصانیف میں بھی کیا ہے ۔ ان کے یہاں بھی شبلی کی طرح نہ معمے ملتے ہیں اور نہ پہیلیاں بجھوائی جاتی ہیں ۔ وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں ایک ہی نظر میں قاری سمجھ لیتا ہے ۔

شبلی کی طرح اُن کا اندازِ تحریر ، نہایت سادہ اور تاریخ نویسی کے لیے خاص طور پر موزوں ہے ، انھوں نے اپنی تحریروں میں باقاعدہ یہ کوشش کی ہے کہ کہیں ان کا انداز بیان سادگی کے دائرے سے نکلنے نہ پائے ۔

اس معاملے میں بھی سرسید ، شبلی کے ہم خیال تھے کہ تاریخ کو جنگی حالات اور تخت نشینی کے ذکر تک محدود نہیں رکھنا چاہیے بلکہ وہ بھی شبلی کی طرح انتظام حکومت ، مملکت کی معاشی حالت ، فوجی انتظام ، عدالت اور اس کی جزئیات وغیرہ کا ذکر تاریخ کی تکمیل کے لیے ضروری سمجھتے ہیں ۔ انھیں شبلی کی طرح تاریخ نویسی کی یہ خصوصیت خاص طور پر پسند تھی[2] ۔" اپنی تصانیف میں انھوں نے تمدنی اور تہذیبی حالات کے ذکر کا خاص خیال رکھا یہاں تک کہ اپنی ایک اہم کتاب "آثارالصنادید" اسی شوق کی تکمیل کی خاطر وقف کر دی ۔

۱ ۔ سرسید ، دیباچہ الماسون صفحہ د

۲ ۔ ایضاً صفحہ ج

ہر چند یہ کتاب دہلی اور اس کے مضافات کی عمارتوں کے ذکر کے لیے مخصوص تھی لیکن اس کے باوجود سرسید نے تہذیبی تمدنی اور معاشرتی زندگی کے بیان کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے کتاب کے چار ابواب میں سے ایک ان مباحث کے لیے مخصوص کیا ۔ آثارالصنادید کے پہلے ایڈیشن میں اس کا پہلا باب دہلی کے باہر کی عمارتوں کے لیے مخصوص تھا ، دوسرے باب میں قلعہ معلّٰی کی عمارتوں کا بیان تھا ۔ تیسرے میں دہلی شہر کی عمارتوں کا ذکر تھا اور چوتھا باب خاص طور پر دلی اور دلی کے لوگوں کے حالات کے بیان کے لیے رکھا گیا تھا ۔

سرسید اس اصول کے بھی قائل ہیں کہ مورخ کو ہمیشہ ہر چیز کا غیر جانبداری سے جائزہ لینا چاہیے اور بے دھڑک سچ بات کہہ دینی چاہیے ، چاہے اس کے لیے اسے کتنی ہی مصیبتیں جھیلنی پڑیں ۔ "سرکشئی ضلع بجنور" کی ابتدا کرتے ہوئے انھوں نے اپنے اس نقطہ نظر کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے : الٰہی تو مجھ کو توفیق دے کہ یہ تاریخ میری پوری ہو اور صحیح بات اس میں لکھنے کی ہدایت کر کیونکہ طرفداری کی تاریخ لکھنی ایسی بے ایمانی کی بات ہے کہ اس کا اثر ہمیشہ رہتا ہے ، اس کا وبال قیامت تک مصنف کی گردن پر ہوتا ہے[1] ۔"

سرسید کے اس بیان سے ان کی تاریخ نویسی کے شعور اور نقطہ نظر دونوں کا پتہ چلتا ہے وہ عملاً بھی اس اصول پر کاربند نظر آتے ہیں ۔ چنانچہ ۱۸۵۷ع کے ہنگامہ خیز دور کے بعد جب کہ ہندوستان بھر میں مسلمانوں کی عزت ، ناموس اور

---

۱ - سرسید ، تاریخ سرکشئی ضلع بجنور صفحہ ۱۳۲

غیرت کچھ محفوظ نہیں تھا اور ان کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے ، ان حالات میں انگریزوں یا انگریز حکومت کے خلاف کچھ لکھنا ظاہر ہے ایک مہلک خطرے کو دعوت دینا تھا لیکن سرسید نے اس بات کی مطلق پروا نہ کرتے ہوئے ایک طرف تو شبلی کو ترغیب دی کہ وہ مسلمانوں کو اُن کی گزشتہ عظمت کے واقعات سنا کر اُن کے دلوں سے وہ احساس کمتری دور کرنے کی سعی کریں جو جنگِ آزادی میں شکست کے بعد ان کے دلوں میں پیدا ہو گیا تھا اور دوسری طرف وہ خود انگریزوں کو ان کی خامیوں اور کوتاہیوں کی روداد سنانے بیٹھ گئے - اس سلسلے میں اُنھوں نے "رسالہ اسبابِ بغاوت ہند" لکھ کر بہت سے ایسے حقائق اور شواہد کو ظاہر کیا جو شاید زمانے کی نظر سے اوجھل رہ جاتے - انھوں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ انگریز کے خلاف کچھ لکھنا یا کہنا سولی کا پھندا گلے میں ڈالنے کے مترادف ہوگا وہ کچھ لکھ دیا جو بڑے بڑوں کے بس کی بات نہ تھی -

تاریخ نویسی کے یہ اُصول تقریباً وہی ہیں جن کی رہنمائی میں مولانا شبلی نے مورخ کی حیثیت سے اہم مقام پایا - شبلی اور سرسید دونوں نے انھیں جان سے زیادہ عزیز جان کر اپنی تاریخوں میں برتا ہے لیکن تاریخ نویسی کی داستان یہیں ختم نہیں ہو جاتی - ان اصولوں کے علاوہ تاریخ نویسی کے چند اور اہم تقاضے بھی ہیں جن میں سے ایک تحقیق و تدقیق کے ذریعے واقعات کی جانچ پڑتال کرنا ہے - شبلی نے تاریخ اور تحقیق کو لازم و ملزم گردانا ہے ، سرسید بھی اس کی اہمیت سے بے خبر نہیں تھے - ایک جگہ لکھتے ہیں : "اس تاریخ میں جو کچھ لکھا ہے بہت سا اس میں میری آنکھوں کا دیکھا اور بہت سا

اپنے ہاتھ کا کیا ہوا ہے اور اس کے سوا جو کچھ لکھا ہے وہ نہایت تحقیقات سے اور بہت صحیح اور نہایت ہی سچ لکھا ہے[۱]“ -

تحقیق و تدقیق کی اہمیت کے اس اندازے کے باوجود انھوں نے اپنی تصانیف میں تحقیق پر زیادہ زور نہیں دیا - شبلی تحقیق کی خاطر اپنے تن من کی بازی لگادیتے ہیں لیکن سرسید تحقیق کے بجائے تاویلوں سے کام چلاتے ہیں - اس خامی کی وجہ سے سرسید کی تاریخ سے متعلق تصانیف کی اہمیت شبلی کی تصانیف کے مقابلے میں کم ہو جاتی ہے ورنہ تاریخ نویسی کی دوسری ضروریات اور مقتضیات پوری کرنے میں وہ شبلی سے کسی طرح پیچھے نہیں رہے -

سرسید کے بعد معاصر مورخین میں ذکاء اللہ ، شبلی کے دوسرے بڑے ”ہم پیشہ“ ہیں- ان کی تاریخی تصانیف کی تعداد سترہ کے قریب ہے جن میں تاریخ ہند کی پندرہ جلدیں اور کرزن نامہ وغیرہ شامل ہیں[۲] -

ذکاء اللہ دبستانِ سرسید کے اہم مصنف ہیں لیکن اپنی ریاضت اور اپنے تصنیفی کام کے مرعوب کن حجم کے باوجود وہ اپنا مقام، عناصر خمسہ کی محفل میں نہ بنا سکے جس کی وجہ محض یہ ہے کہ اُن کی شخصیت میں وہ چمک دمک نہ تھی جو انھیں اس محفل کی صحیح راہ دکھاتی - اردو کے عناصرِ خمسہ میں ذکاء اللہ کا شمار ہونے نہ ہونے سے قطع نظر اس میں بہر طور

---

۱ - تاریخ سرکشیٔ ضلع بجنور صفحہ ۱۳۲

۲ - تفصیل کے لیے رجوع کیجیے ، راقم الحروف کا مضمون ”ذکاءاللہ کی تاریخِ ہندوستان“ - مطبوعہ ”ماہ نو“ کراچی مئی ۶۸ع

کوئی شبہ نہیں کہ مؤرخینِ اردو کی محفل میں وہ ضرور شہ نشین ہیں اور بجا طور پر شہ نشین ہیں۔

تاریخ ہندوستان کے طویل مقدمے اور ذکاء اللہ کی تصانیف کے مطالعے سے ان کے مؤرخانہ تصورات اور خیالات منضبط کیے جا سکتے ہیں۔

شبلی کی طرح ان کے نزدیک بھی تاریخ کو تہذیبِ انسانی کے ہر پہلو کا نمائندہ ہونا چاہیے، چنانچہ وہ تاریخ کو جنگ و جدل اور بادشاہ کی تخت نشینی کے واقعات تک محدود نہیں سمجھتے، انھیں اہمیت ضرور دیتے ہیں لیکن اتنی بھی نہیں کہ وہ تاریخ نویسی کے دوسرے تقاضوں پر چھا جائیں۔ جہاں کہیں بھی انھیں موقع ملتا ہے وہ رعایا کے حالات، اُن کے افکار و احساسات اور دوسری تہذیبی روایات کا ذکر ضرور کرتے ہیں حتٰی کہ کسی عمارت یا لوگوں کے رہن سہن کا ذکر آ جائے تو صفحے کے صفحے اس کی خاطر قربان کرتے چلے جاتے ہیں اور نہایت تفصیل سے اس سلسلے کی جزئیات تک کا ذکر کرتے ہیں۔

سچائی اور سچ بات کہنے کو وہ بھی دوسرے مؤرخین کی طرح تاریخ نویسی کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ ایک جگہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں: "مؤرخ جو کچھ لکھے وہ بیان واقعہ ہو، کل حالات کو قیدِ کتابت میں لائے یعنی جیسے کہ اکابر و اعیان کے فضائل و خیرات و عدل و انصاف تحریر کیے ہیں ایسے ہی مقابح و رذائل اس کے ذکر کرے اور کسی بات کو چھپائے نہیں[1]۔" کہنے کو تو مولوی ذکاء اللہ نے یہ بات کہہ دی لیکن سچی بات یہ ہے کہ سچائی کی خاطر وہ اپنی جان قربان

---

[1] ذکاءاللہ، تاریخ ہندوستان (حصہ اول) صفحہ ۱۴

کرنے کے لیے کبھی بھی تیار نہیں ہوتے - چنانچہ ان کا خیال ہے کہ جہاں سچائی مصلحت کے خلاف ہو، وہاں اس سے آنکھ بچا کر نکل جانا چاہیے -

اس سلسلے میں مورخ کی وکالت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ "اگر کسی خوف و ہراس کے سبب سے ہم عہد و ہم عصر کی برائیاں نہ لکھ سکے تو اس میں وہ معذور ہے[۱] -" یہی وہ حد ہے جو ذکاء اللہ اور شبلی کو جدا کرتی ہے - ذکاء اللہ کہتے تو ہیں کہ "اگر مورخ صاف صاف کوئی بات نہ لکھ سکتا ہو تو اسے اشاروں، کنایوں سے اس کا ذکر ضرور کر دینا چاہیے[۲] -" مگر عملی طور پر وہ یہ کچھ کرتے نہیں - اپنی اسی احتیاط پسندی کی وجہ سے انھوں نے اپنی کتابوں میں یورپی مؤرخین کے مسلمان حکمرانوں پر لگائے ہوئے اعتراضات کا جواب دینے سے بھی احتراز کیا ہے جب کہ شبلی کی تاریخیں ایسے جوابات کا مجموعہ اور مرقع ہیں -

شبلی کی تاریخ نویسی ایک مقصد کی خاطر شروع ہوئی تھی اور وہ مقصد جیسا کہ پہلے بھی بارہا بیان ہو چکا ہے یہ تھا کہ کسی طرح مسلمانوں کے آبا و اجداد کی عظمت، کی داستانیں سنا کر ان کے دل سے پستی کا احساس دور کیا جائے - کسی حد تک بلکہ میرے خیال میں پوری طرح اسے ایک مذہبی مقصد قرار دیا جا سکتا ہے یعنی اگر یوں کہہ لیں کہ شبلی کی تاریخ نویسی میں ہر جگہ ان کا دین چھایا ہوا ہے

---

۱ - ذکاءاللہ، تاریخ ہندوستان (حصہ اول) صفحہ ۸

۲ - ایضاً صفحہ ۱۴

تو غلط نہ ہوگا ۔ اس بات کے باوجود شبلی تاریخ نویسی کے بنیادی اصولوں کو مذہب کی خاطر قربان نہیں کرتے ۔ وہ ناموران اسلام کا (جن سے انھیں بے پناہ عقیدت ہے) ذکر کرتے ہوئے ان کی اچھائیوں کے ساتھ ساتھ ان کی برائیاں بھی گناتے جاتے ہیں ، یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے ناموران اسلام میں چنا ہی ایسے لوگوں کو ہے جن کی اچھائیاں ان کی برائیوں پر بھاری ہیں ۔ دوسری طرف ذکاء اللہ تاریخ نویسی کے لیے ''راسخ العقیدہ اور مذہبی ہونے کو بنیادی شرط رکھتے ہیں[۱]۔'' اسی بات کی وضاحت کرتے ہوئے وہ ایک جگہ رقمطراز ہیں :

"جب مورخ متدین و امین ہوگا تو اس سے اطمینان قلبی حاصل ہوگا کہ ایسا شخص دین کو دنیا کی غرض سے نہیں بیچے گا[۲] ۔" یہ بات شبلی اور ذکاء اللہ کے یہاں دوسری حد فاصل ہے اور یہی مورخ شبلی کو مؤرخ ذکاء اللہ سے بلند کرتی ہے ۔

تیسری بات جو شبلی اور شمس العلماً ذکاء اللہ کی تاریخ نویسی کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے ، وہ ہے تاریخ کا تحقیق سے رشتہ ۔

شبلی تحقیق کو تاریخ نویسی کی شہ رگ ٹھیراتے ہیں جب کہ ذکاء اللہ محض اتفاق سے تحقیق کو منہ لگاتے ہیں ۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ : "محققانہ تاریخ نگاری ان کے بس کی بات نہ تھی[۳] ۔"

یوں تو مؤرخ ذکاء اللہ کے کارنامے ہزاروں صفحوں میں

---

۱ ۔ ذکاءاللہ ، تاریخ ہندوستان (حصہ اول) صفحہ ۱۴

۲ ۔ ایضاً صفحہ ۱۵

۳ ۔ ڈاکٹر سیدعبداللہ، سرسید اور ان کے رفقاء صفحہ ۱۸۴

پھیلے ہوئے ہیں لیکن محقق ذکاء اللہ سے ہماری ملاقات کم ہی ہوتی ہے حالانکہ ان کا لکھا ہوا "مقدسہ تاریخ"، پڑھ کر ایسا گمان ہوتا ہے جیسے وہ بھی شبلی کی طرح روایت و درایت کے قائل تھے۔ کسی بات کو وہ صرف اسی وقت سچ مانتے ہیں جب کہ "کہنے والا ثقہ اور راست گو ہو اور جو کچھ وہ کہے اس پر عقل بھی گواہی دیتی ہو کہ خبر درست ہے[1]"۔ لیکن معلوم نہیں کیوں جب بھی تحقیق کی ضرورت ہوتی ہے وہ کنی کاٹ جاتے ہیں اور بجائے اس کے کہ تحقیق سے کوئی بات طے کریں، فوراً فیصلہ سنا دیتے ہیں مثلاً شبلی نے "اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر"، میں اورنگ زیب اور اس کے بھائیوں کے تعلقات کے سلسلے میں جس تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہے اس کی مثال شاید ہی کہیں ملے۔ دوسری طرف جب داراشکوہ کا مقدمہ ذکاءاللہ کے سامنے پیش ہوا تو انھوں نے پورا قصہ اپنے آپ بیان کرنے کے بعد فیصلہ دے دیا کہ "اصل حال تو یہ ہے جو لکھا گیا اب آگے جھوٹی کہانیاں بنائی گئی ہیں[2]"۔

ذکاءاللہ کے یہاں تحقیق کے فقدان کی وجہ بظاہر صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ کسی بات پر یقین لانے کے لیے جیسا کہ ابھی ذکر ہوا صرف یہی کافی سمجھتے تھے کہ عقل اس پر گواہی دیتی ہو۔

یہ عجیب بات ہے کہ اس عقل کی گواہی کی بدولت بعض بعض موقعوں پر تحقیق و تدقیق کے بغیر بھی انھوں نے ایسی باتیں کہہ دی ہیں جن پر بلا حیل و حجت ایمان لے آنے کو جی

---

۱ - تاریخ ہندوستان (اول) صفحہ ۵
۲ - ایضاً (ہشتم) صفحہ ۸۹

چاہتا ہے۔ اس سلسلے کی ایک مثال ملاحظہ ہو :

حالانکہ یہ بات اب تحقیق نے ثابت کر دی ہے کہ محمد تغلق کا اپنے باپ غیاث الدین تغلق کی موت میں قطعاً کوئی ہاتھ نہ تھا لیکن اس کے باوجود اب تک بعض مؤرخ اس پر یہ الزام رکھتے ہیں کہ اس نے جان بوجھ کر لکڑی کا ایسا محل تعمیر کرایا تھا جو اس کے منصوبے کے مطابق غیاث الدین پر آگرا اور وہ دب کر مر گیا۔ تاریخ ہندوستان لکھتے ہوئے یہ مقدمہ ذکاءاللہ کے سامنے پیش ہوا تو وہ فوراً بول اٹھے : "یہ امر عقل سے بعید معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ الغ خان دسترخوان پر موجود تھا۔ یہ کرامت اس میں کہاں سے آئی تھی کہ جس وقت وہ وہاں سے اٹھ کر باہر آئے۔ اسی وقت مکان گر جائے[1]"۔

ایک اور چیز جو ذکاءاللہ اور شبلی کو ایک دوسرے سے تاریخ کے میدان میں جدا کرتی ہے، وہ ہے دونوں کا طرز تحریر اور طریقۂ بیان۔ شبلی تاریخ لکھتے بیچ بیچ میں تاریخی تقاضوں کو ٹھیس پہنچائے بغیر، ایسے دلچسپ قصے سناتے جاتے ہیں جن سے کتاب میں دلچسپی اور دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف ذکاء اللہ کے یہاں ایسے قصوں کی کوئی گنجائش نہیں، انھیں اپنے کام سے کام ہوتا ہے، تاریخ لکھنے میں وہ ایسے محو ہو جاتے ہیں کہ انھیں ادھر ادھر کی سوچنے کا ہوش ہی نہیں رہتا۔ ایک تو ویسے ہی ان کا طرزِ بیان خشک ہے دوسرے ان قصوں کے فقدان نے ان کے یہاں کچھ اور بے نمکی اور بے کیفی پیدا کر دی ہے۔

سرسید اور ذکاءاللہ کی طرح محمد حسین آزاد بھی ہماری ادبی محفلوں کی روح رواں ہیں، زبان و ادب سے متعلق کوئی

۱۔ تاریخ ہندوستان (دوم) صفحہ ۱۰۶

میدان ایسا نہیں جہاں انھوں نے گلکاری نہ کی ہو۔ تاریخ کے میدان میں بھی انھوں نے ''دربار اکبری'' نامی ایک یادگار چھوڑی ہے۔ اردو میں ان کے پائے کا انشا پرداز آج تک پیدا نہیں ہوا، شبلی تو ان کی انشا پردازی کے اس حد تک قائل تھے کہ ایک موقع پر انھوں نے لکھا تھا: ''آزاد کی کتاب آئی، جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں لیکن گپیں بھی ہانک دیتا ہے تو وحی معلوم ہوتی ہیں'[1]۔'' اس بیان میں شبلی نے آزاد کے فن کے دو پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک کی برائی میں اور دوسرے کی تعریف میں۔ یہ عجیب بات ہے کہ تاریخ کی دنیا میں آ کر وہ خوبی بھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شبلی نے آزاد کی گپوں کو وحی کا درجہ دیا ہے، برائی بن جاتی ہے۔ انشا پردازی اور تاریخ کا آپس میں کوئی تعلق نہیں، یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے سم قاتل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آزاد کا مزاج محقق کا نہیں، بلکہ ایک داستان گو اور انشا پرداز کا مزاج ہے یہی وجہ ہے کہ وہ واقعات سے حقائق تلاش کرنے کے بجائے ان میں سے داستانیں اور کہانیاں چننے کی فکر میں لگ جاتے ہیں اور یوں داستانیں اور کہانیاں چنتے چنتے اپنی یعنی تاریخ کی راہ سے بھٹک کر کہیں دور نکل جاتے ہیں۔ یہ ان کے مزاج کی بات ہے ورنہ ایسا نہیں کہ تاریخ نویسی کی مقتضیات سے وہ آشنا نہ تھے بلکہ سچ یہ ہے کہ فن تاریخ نویسی کی ضروریات کو وہ بڑی اچھی طرح سمجھتے تھے، ''دربار اکبری'' اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

۱۔ خط نمبر ۳۶ بنام مہدی افادی، مکاتیب شبلی جلد دوم صفحہ ۲۱۱

شبلی کی طرح آزاد بھی تاریخ میں تہذیبی و تمدنی واقعات کے ذکر کو ضروری خیال کرتے ہیں ، صرف شہنشاہ کے حالات لکھنا ان کے نزدیک بھی پسندیدہ نہیں - ایک جگہ لکھتے ہیں:
"لوگ کہیں گے کہ آزاد نے "دربار اکبری" لکھنے کا وعدہ کیا اور شاہنامہ لکھنے لگا - لو اب ایسی باتیں لکھتا ہوں کہ جن سے شہنشاہ موصوف کے مذہب ، اس کے عہد کے رسم و رواج اور کاروبار کے آئین آئینہ ہوں[1] -" آزاد کا یہ بیان اس بات کا مظہر ہے کہ وہ شاہ پرست نہیں بلکہ تہذیبی و تمدنی حالات کے ذکر کے پرستار ہیں لیکن اس کے ساتھ وہ مہمات اور فتوحات کو بھی بے حد اہمیت دیتے ہیں - شبلی کے یہاں مہمات اور فتوحات کے ذکر کو تہذیبی ، تمدنی اور معاشرتی حالات کے ذکر کے مقابلے میں ثانوی حیثیت دی گئی ہے لیکن آزاد کے یہاں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ جنگوں کے حالات نہایت تفصیل سے لکھنے پر تلے بیٹھے ہوں - اکبر کے زمانے کی مختلف مہمات کے تفصیلی تذکرے اس بات کی واضح دلیل ہیں - آزاد کے اس شوق کا اظہار ان کے ایک بیان سے بھی ہوتا ہے - ایک جگہ بدایونی کی "منتخب التواریخ" کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :
"ان کی تاریخ میں یہ کوتاہی ضرور ہے کہ مہمات اور فتوحات کی تفصیل نہیں[2] -" یعنی وہ مہمات اور فتوحات کا تفصیلی ذکر نہ کرنے کو مؤرخ کی کوتاہی پر محمول کرتے ہیں -

اچھی تاریخ نویسی کے لیے سب سے اہم اصول واقعات کا غیر جانبدارانہ جائزہ ہے - ہر چند شبلی کو بھی کلی طور پر

---

۱ - محمد حسین آزاد، دربار اکبری صفحہ ۳۵

۲ - دربار اکبری صفحہ ۲۰۰

غیر جانبدار نہیں کہا جاسکتا لیکن اس کے باوجود وہ غیر جانبدار ہیں کیونکہ وہ غیر جانبدار رہنے کی کوشش برابر کرتے ہیں اور تصویر کے دونوں رخ دکھاتے ہیں ایسا صرف کہیں کہیں ہوتا ہے کہ وہ اپنی راہ سے بھٹک جائیں لیکن آزاد مستقل بھٹکے ہوئے راہی معلوم ہوتے ہیں ۔ وہ غیر جانبدار نہیں ، جانبدار اور بالکلیہ جانبدار ہیں ۔ ان کی جانب داری ، ایک خاص وجہ سے ہے اور وہ یہ کہ وہ ہیرو پرست ہیں اور اپنے ہیرو کی تعریف و تحسین کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار رہتے ہیں ۔ شبلی نے بھی جن لوگوں کی سوانح لکھی ہے وہ ان کے عقیدت مند ہیں لیکن وہ اس عقیدت کے باوجود انھیں ایک ہیرو کی طرح پوجتے نہیں بلکہ ان کی اچھائیوں کے ساتھ ساتھ ان کی برائیاں بھی گناتے جاتے ہیں ۔ شبلی اور آزاد کی تاریخ نویسی کے انداز کار کو دیکھ کر کہا جاتا ہے کہ شبلی مرکز سے دائرے کی طرف پھیلتے ہیں اور آزاد دائرے سے چپک کر رہ جاتے ہیں ۔

شبلی کو جہاں کہیں بھی اپنے ہیرو کی خامی دکھائی دیتی ہے وہ کھلے لفظوں میں اس کا اعتراف کر لیتے ہیں ۔ دوسری طرف آزاد کے یہاں یہ ہے کہ اگر وہ کہیں اپنے ہیرو کی خامی دیکھ بھی لیتے ہیں تو غیر واضح اور مبہم الفاظ میں اسے بیان کرتے ہیں ۔ مثلاً ابوالفضل اور فیضی کے وہ مداح ہیں جب ان دونوں پر الزام لگایا گیا کہ وہ خوشامد پسند تھے تو انہوں نے فوراً کہا : ”خوشامد کیا آسان بات ہے پہلے کوئی کرنی تو سیکھے[۱]“ ۔ جب عقیدت اس درجے کو پہنچ چکی ہو تو ظاہر ہے کہ انھیں کسی کی خامی کیسے نظر آسکتی ہے ۔

---

۱ ۔ دربار اکبری صفحہ ۳۶۲

آزاد اور شبلی دونوں انشا پرداز ہیں ، انشا پردازی آزاد کی کمزوری ہے لیکن شبلی انشا پردازی کے عشق میں اس حد تک گرفتار نہیں کہ اس کی خاطر اپنے مقاصد قربان کریں - وہ انشا پردازی کو ہر دم اپنی جان سے لگائے نہیں رکھتے بلکہ کبھی کبھی جب وہ سمجھتے ہیں کہ انشا پردازی سے تاریخ نویسی کی ضروریات کو ٹھیس نہیں پہنچے گی تو وہاں اس سے کام لیتے ہیں جب کہ آزاد انشا پردازی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اس بات نے ان کی تاریخ میں کئی خامیاں پیدا کردی ہیں مثلاً ان کے یہاں واقعات کی غیر ضروری تفصیل ملتی ہے جو کسی حد تک تاریخ نویسی کے لیے مضر ہے - بعض بعض موقعوں پر آزاد کا انداز بیان اتنا رنگین ہو جاتا ہے کہ اگر وہ حقیقت بھی بیان کر رہے ہوں تو وہ حقیقت نہیں معلوم ہوتی - اس سلسلے میں ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں : ''آزاد کے یہاں تاریخ اپنی برہنہ سچائیوں اور سائنسی برہنگی کے باوجود تخیل کے ایسے رنگین لباس میں ملبوس ہو کر منظر عام پر آتی ہے کہ بعض اوقات یہ فیصلہ کرنا واقعی مشکل ہو جاتا ہے کہ اس کو حقیقت کہیں یا افسانہ[1]''۔ شبلی کے یہاں یہ خاص بات ہے کہ وہ انشا پرداز ہونے کے باوجود ایجاز و اختصار کے قائل ہیں ، وہ بڑی سے بڑی بات چند فقروں میں کہہ جاتے ہیں اور یہ ایک مؤرخ کے لیے بڑے کام کی بات ہے - اس کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں کبھی بھی یہ نہیں ہوتا کہ وہ انشا پردازی کی خاطر حقیقت کو نظر انداز کر دیں -

آزاد غیر محتاط اور شبلی ایک محتاط مؤرخ ہیں ، شبلی جو کچھ کہتے ہیں اسے کہنے سے پہلے تحقیق کی ترازو میں تول

---

۱ - ڈاکٹر سید عبداللہ ، میر امن سے عبدالحق تک صفحہ ۲۱۰

لیتے ہیں لیکن آزاد تحقیق کے پابند نہیں ۔ انشا پردازی نے انہیں جتنا غیر محتاط بنا دیا ہے اسے جانے دیجیے کہ پوری "دربار اکبری" اس بد احتیاطی کا شکار ہے ، مزے کی بات تو یہ ہے کہ آزاد کے یہاں بے احتیاطی اس درجے پر پہنچ جاتی ہے کہ وہ ایک ہی واقعے کو دو مختلف صورتوں میں بھی لکھ جاتے ہیں ۔ مثلاً شاہ ابوالمعالی کی گرفتاری کے واقعے کو انہوں نے دو مختلف طرحوں سے لکھا ہے ، ایک جگہ لکھتے ہیں :

"جب دربارِ تخت نشینی منعقد ہوا تھا تو شاہ ابوالمعالی اس میں شامل نہ ہوئے تھے اور پہلے بھی ان کی طرف سے کھٹکا تھا ۔

... بیرم خاں نے امراء سے مشورت کی اور تیسرے دن دربار سے پیغام بھیجا کہ بعض مہماتِ سلطنت میں مصلحت درپیش ہے ، ارکانِ دولت حاضر ہیں، بے تمہارے صلاح ناتمام ہے ، تھوڑی دیر کے لیے تشریف لانا مناسب ہے' ۔" تھوڑے سے بحث مباحثے کے بعد شاہ صاحب تشریف لائے اور بعض امورات سلطنت میں گفتگو ہوئی ۔ اسی عرصے میں دستر خوان بچھا۔ شاہ صاحب نے سلابچی پر ہاتھ بڑھائے ۔ تولک خان قوچین افسرِ توپ خانہ ان دنوں خوب بھسنڈ بنا ہوا تھا ۔ بے خبر پیچھے سے آیا اور شاہ کی مشکیں کس لیں ، شاہ تڑپ کر اپنی تلوار کی طرف پھرے جس سپاہی زادے کے پاس تلوار رہتی تھی اسے پہلے ہی کھسکا دیا تھا ۔ غرض کہ شاہ قید ہو گئے[۲] ۔"

---

۱ - دربار اکبری صفحہ ۱۲

۲ - ایضاً صفحہ ۱۳

اسی واقعے کو ایک اور جگہ یوں بیان کیا ہے: "جن دنوں اکبر تخت نشین ہوا ایک سپاہی زادہ جیسا صورت میں حسین اور صاحبِ جمال تھا ویسا ہی عادات و اطوار میں نیک خصائل تھا۔ شاہ ابوالمعالی نے اسے نوکر رکھا تھا۔ بیرم خاں نے ... اس لڑکے کو وہاں سے ابھارا اور کئی دن تک غائب رکھا۔ شاہ بے قرار ہو گئے۔

دو تین دن کے بعد بیرم خان نے پیغام بھیجا کہ تمھارے خدمت گار کو بڑی تلاش سے پیدا کیا ہے مگر ڈر کے مارے تمھارے پاس آنے کو راضی نہیں ہوتا، یہ ٹھیرائی ہے کہ تم حضور میں آؤ۔ حضور خود اس کی سفارش فرمائیں اور تمھارے سپرد کر دیں۔ شاہ سنتے ہی خوش ہو گئے[۱]۔"

اسے لینے آئے تو "بیرم خان نے اِدھر اُدھر کی چند باتیں پیش کر کے اس سپاہی زادے کو بلا لیا۔ بادشاہ نے اس کی خطا معاف فرمائی اور شاہ سے کہا کہ اب اس سے خفا نہ رہو۔ شاہ نے کہا نہیں خفگی کا کیا مول ہے، اکبر نے کہا اچھا جس طرح پہلے تمھاری تلوار اس کے ہاتھ میں رہتی تھی، اس طرح اب بھی رہا کرے۔ شاہ تو دل دیے بیٹھے تھے جو نوکر تلوار لیے تھا اسے اشارہ کیا کہ اسے دے دو اس نے دے دی۔

اس عرصے میں دستر خوان بچھا۔ میر نے سلاپچی پر ہاتھ بڑھائے کہ دھوئیں۔ تولک خان قوچین افسر توپخانہ ان دنوں خوب بھسند بنا ہوا تھا اسے گھات میں لگا رکھا تھا۔

۱۔ دربار اکبری صفحہ ۸۰۳-۸۰۵

بے خبر پیچھے سے آیا اور مشکیں باندھ لیں[1] ۔"

اس واقعے کے بیان میں آزاد نے جس بے احتیاطی سے کام لیا ہے اس کی مثال یا نظیر کسی مورخ کے یہاں مشکل سے ملے گی ۔ اس قسم کی بد احتیاطیوں کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آزاد شبلی سے بڑے انشاء پرداز تو بے شک ہیں لیکن ان سے بڑے مؤرخ ہرگز نہیں ۔ ان کی انشاء پردازی نے انھیں شعریت سے بہت قریب اور تاریخ نویسی سے بہت دور کر دیا ہے ۔

یوں بھی دیکھا جائے تو آزاد کی طبیعت تاریخ نویسی کی طرف کم اور داستان گوئی کی طرف زیادہ مائل تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی لکھی ہوئی تاریخوں میں اگر ایک طرف تحقیق کا فقدان ہے تو دوسری طرف ان کا طرز نگارش بیانیہ ہے ، کوئی بات کہنے کے لیے سند ڈھونڈنے اور لکھنے کا تکلف انھوں نے کم ہی کیا ہے ۔ تقریباً سوا آٹھ سو صفحوں میں پھیلی ہوئی کتاب ''دربار اکبری'' میں گنتی کی دس بیس باتیں ہی ہوں گی جن کے لیے آزاد نے کوئی سند پیش کی ہے ورنہ عموماً انھوں نے واقعات اپنی مرضی سے بیان کر دیے ہیں ۔

اسی طرح یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گی کہ انھوں نے بعض بہت ہی معمولی نوعیت کی باتوں کو تو بےحد تفصیل سے بیان کیا ہے لیکن کچھ ایسی اہم باتیں جن کا بیان نہایت اہم اور ضروری تھا وہ کلیتاً نظر انداز کر گئے ہیں ، جس کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ انھوں نے اکبر کے دین و اعتقاد

---

۱ - دربار اکبری صفحہ ۷۴۵

کی ابتدا و انتہا کے نام سے دربار اکبری میں باقاعدہ ایک عنوان تو قائم کیا ہے لیکن پوری کتاب میں کہیں بھی اکبر اور دین الٰہی کے تعلق کا بیان نہیں ملتا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ آزاد کسی حد تک محض ارباب سلطنت سے متعلق دل چسپ واقعات کے بیان کو تاریخ سمجھتے تھے، اس بات کا اظہار دربار اکبری کے ٹائٹل سے بھی ہوتا ہے جس پر یہ عبارت درج ہے :''دربار اکبری، یعنی جلال الدین اکبر بادشاہ ہندوستان اور اس کے دربار کے امرائے جلیل القدر مثلاً بیرم خان خانخاناں، امیر الامراء خان زمان، علی خاں شیبانی، منعم خان خاناں، مہیش داس بیربر، ابوالفیض فیضی فیاضی، شیخ عبدالقادر بدایونی، شیخ ابو الفضل، موتمن الدولہ عمدۃ الملک راجہ ٹوڈر مل، راجہ مان سنگھ، مرزا عبدالرحیم خان خاناں وغیرہ کے دل چسپ حالات‘‘۔ دوسری طرف اسی خامی یا کوتاہی کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آزاد کی طبیعت کا میلان کسی اور طرف ہو تو ہو تاریخ نویسی کی طرف ہرگز نہ تھا۔ انھوں نے '' دربار اکبری '' لکھی تو ہے لیکن کسی تاریخی تقاضے کو پورا کرنے کے لیے نہیں بلکہ محض اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی اس تصنیف میں واقعات اور حقائق کے بیان سے زیادہ انداز تحریر اور طرز بیان کو سنوارنے پر زور دیا ہے، انھیں اس کی پرواہ ہرگز نہ تھی کہ کوئی تاریخی واقعہ حقیقت سے ہٹ کر کسی غلط طرح بیان ہو جائے لیکن لطافت بیان سے دلچسپی ضرور تھی - یہی وجہ ہے کہ تاریخ نویسی کے بکھیڑوں میں وہ کم ہی پڑے ہیں اکثر و بیشتر اپنا انداز بیان سنوارنے میں مگن رہے ہیں، جس کا اعتراف انھوں نے ایک خط میں خود بھی کیا ہے

''دربار اکبری'' کی وقعت انہیں محض اس بات میں نظر آتی تھی کہ طرز بیان کے اعتبار سے یہ ایک عمدہ کتاب تھی ، چنانچہ لکھتے ہیں : ''دربار اکبری ، سات آٹھ سو صفحوں کی کتاب میں نے لکھی ہے ، اس میں امرائے عہد اکبر کے حالات اس لطافت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں ، جس طرح میر ، سودا ، سید انشا کے حالات آپ نے آب حیات میں دیکھے[1] ۔''

بلا شبہ ادبی اعتبار سے مولانا کی کتابوں میں جو مقام ''دربار اکبری'' کو حاصل ہے وہ شاید ان کی کسی بھی تصنیف کو حاصل نہیں ۔ اس کے بارے میں ان کا ذاتی طور پر خیال تھا کہ یہ ان کی ایک ایسی باغ و بہار تصنیف ہے جس پر کبھی بھی خزاں نہیں آئے گی[2]۔

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ادبیت کے اعتبار سے اردو ادب میں جو مقام اس تصنیف کو حاصل ہے وہ کسی صورت بھی کم نہ ہو گا لیکن جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے اس کی افادیت ، اہمیت اور بڑائی کا دعویٰ تو خود آزاد کو بھی نہ تھا اور نہ ہی ہونا چاہیے تھا البتہ تاریخی اعتبار سے اس کی یہ اہمیت تو ضرور ہے کہ بعض بعض ایسے واقعات کا ذکر بھی مولانا نے بڑی تفصیل سے کیا ہے جن کا ذکر اکبر کے عہد کی دوسری تاریخوں میں کچھ زیادہ تفصیل سے نہیں ملتا ۔ ''دربار اکبری'' کی ادبی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے خواجہ حسن نظامی نے کہا تھا : ''دربار اکبری ، اردو میں اپنی مثال آپ نہیں رکھتی اور میں نے اسی سے اردو لکھنا سیکھی ہے[3] ۔''

---

۱ ۔ خط بنام سید ناصر نذیر فراق ، مکتوبات آزاد ۔
۲ ۔ " " مورخہ ۵ جون ۱۸۸۷ء
۳ ۔ مقدمہ مکتوبات آزاد

اس بیان میں یقیناً کسی شبے کی گنجائش نہیں "دربارِ اکبری" کی ادبی اہمیت کے بارے میں کوئی اس سے بڑھ کر بھی دعویٰ کرے تو شاید کم ہو لیکن تاریخ میں اس کے مرتبے کے بارے میں یقیناً یہ بات نہیں کہی جا سکتی -

شبلی اور آزاد کی تاریخ نویسی میں ایک قدر خاص طور پر مشترک ہے ، لیکن اس قدر مشترک کا تعلق تاریخ نویسی کے فن سے بہت کم ہے - جیسا کہ اس سے پیشتر بیان ہوا ہے ، شبلی نے تاریخ لکھتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ ان کی تاریخ میں بے کیفی پیدا نہ ہونے پائے لیکن اس سے بچاؤ کی صورت انھوں نے انشا پردازی یا اسی قبیل کی دوسری چیزوں میں نہیں دیکھی بلکہ اس کے لیے وسیلہ بنایا ہے انھی لوگوں کی زندگی سے متعلق دلچسپ واقعات کو جن کا بیان ان کے پیش نظر ہو - وقتاً فوقتاً اور حسب موقع ایسے واقعات کے بیان سے ان کی لکھی ہوئی تاریخیں بے کیف اور بے مزا کہیں نہیں ہوتیں بلکہ ان میں ایک طرح کی دل کشی اور دلچسپی برابر برقرار رہتی ہے لیکن جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے وہ اس دل کشی اور دلچسپی کے لیے کبھی تاریخ نویسی کے فن کو بالائے طاق نہیں رکھتے بلکہ برابر اس جستجو میں رہتے ہیں کہ ان کا کوئی بھی قدم فن کی دنیا سے ذرا بھی ہٹنے نہ پائے ، چنانچہ ان کے یہاں یہ واقعات ہمیشہ ایسے موقعوں پر بیان ہوتے ہیں جہاں نہ تو تاریخ نویسی کے فن کو ٹھیس پہنچنے کا اندیشہ ہو اور نہ واقعات کا تسلسل ٹوٹنے کا خدشہ - لیکن آزاد کے یہاں

یہ بات نہیں ، شبلی کی طرح وہ بھی تاریخ میں ایسے واقعات کے بیان کو ضروری بھی سمجھتے ہیں اور اہمیت بھی دیتے ہیں ، لیکن اگر ایک طرف شبلی کے یہاں یہ ضرورت اور اہمیت کچھ حدود اور کچھ قیود کی پابند ہوتی ہے تو دوسری طرف آزاد نہ ایسی کسی حد کے پابند ہیں نہ کسی قید کے ، یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں فنی تقاضوں سے شناسائی کے باوجود یہ فنی تقاضے پوری طرح پورے نہیں ہوتے - وہ ان واقعات کے بیان میں اس حد تک کھو جاتے ہیں کہ انھیں کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہتا کہ وہ کہہ کیا رہے ہیں ، دربار اکبری کی مرصع نثر اور لطیفوں کے مرقع حصوں کے علاوہ آزاد کے وہ مضامین بھی جن کا تعلق تاریخی واقعات سے ہے اس کے شاہد عادل ہیں چنانچہ مقالات آزاد کی پہلی جلد جسے مرتب آغا محمد باقر نے اپنے حسن عقیدت کی وجہ سے علمی ، ادبی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ کہا ہے ، اس کے تحقیقی اور تاریخی مضامین کا یہ حال ہے کہ عبد الرحیم خان‌خانان پر لکھے ہوئے مضمون کے کل آٹھ صفحات میں سے ڈیڑھ تو اس کی زندگی کے حالات سے متعلق ہیں اور بقیہ ساڑھے چھ اس کے لطیفوں سے - اسی طرح راجہ بیربر پر لکھا جانے والا مضمون سات صفحات پر مشتمل ہے جس کے تین صفحوں میں راجہ کی زندگی کا حال ہے اور بقیہ چار میں اس سے متعلق لطائف بیان ہوئے ہیں - فن کے تقاضوں سے اس بے اعتنائی کی وجہ محض یہ ہے کہ اُن کی طبیعت میں سنجیدگی نہ تھی اور سنجیدگی کا یہی فقدان ہے جس کی وجہ سے ان کی تاریخ میں تحقیق کی قلت ، فنی تقاضوں سے ہٹے ہوئے واقعات کی بہتات اور جا بجا انشاپردازی کی مرقع تحریریں ملتی ہیں مثلاً اگر ایک طرف ان کے یہاں مختلف ابواب کے عنوانات

کچھ اس طرح کے قائم ہوتے ہیں ، تیر آسمانی اور غیب کی نگہبانی ، علماء و مشائخ کا طلوع اقبال و قدرتی زوال اور گولے آتشیں وغیرہ وغیرہ ، تو دوسری طرف ایسی تحریریں بھی ملتی ہیں جو کسی ادبی تصنیف کے لیے باعث افتخار ہوں تو ہوں کم از کم کسی تاریخ سے متعلق تصنیف کا حصہ قرار نہیں دی جا سکتیں -

یہاں اس سلسلے میں آزاد کی تحریر کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے ان کے چناؤ میں کسی انتخاب کا دخل نہیں بلکہ "دربار اکبری" کی ہر سطر اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہے ، ایک جنگ کا حال ان کے یہاں یوں بیان ہوا ہے :

"لڑائی شروع ہوئی ، پہلے توپ و تفنگ کے گولوں نے لڑائی کے پیغام پہنچائے ، نیزوں کی زبانیں جنبش میں آئیں ، تھوڑی ہی دیر میں لشکر شاہی کا ہراول اور داھنا ہاتھ آگے بڑھا اور اس زور سے ٹکر ماری کہ اپنے سامنے کے حریفوں کو اُلٹ کر پھینک دیا -"

"سیستانی رستم نے جب حریف کی آمد آمد سنی تو جاسوس دوڑائے ، لیکن بادشاہ کے آنے یا کمک منگانے کا کچھ خیال نہ کیا ، فوج کو تیاری کا حکم سنایا اورا مراء کو جمع کر کے مجلس مشورت آراستہ کی ، میدان جنگ کے پہلو تقسیم کیے ، پہلے یہی خبر آئی تھی کہ ہیموں پیچھے آتا ہے ، شادی خان سپہ سالاری کرتا ہوا فوج کو لاتا ہے دفعتہً پرچہ لگا کہ ہیموں خود ہی ساتھ آیا ہے ، پانی پت سے ایک پڑاؤ آگے بڑھ کر گھڑونڈہ پر مورچے باندھے ہیں خان زمان کا آگے بڑھنے کا ارادہ تھا ، مگر تھم گیا ، اور شہر سے ہٹ کر مقابلے پر لشکر جمایا ،

چاروں پہلو امراء پر تقسیم کر کے فوجوں کا قلعہ باندھا، بیچ میں آپ اقبال کا نشان علم کیا ایک بڑا سا چتر تیار کیا، اسے اپنے سر پر لگایا، اور سپہ سالاری کی شان بڑھا کر قلب میں جا کھڑا ہوا، لڑائی شروع ہوئی اور میدان کار زار گرم ہوا، طرفین کے بہادر بڑھ بڑھ کر تلواریں مارنے لگے خان زمانی جانثار بے جگر ہو کر حملے کرتے تھے اور تلوار کی آنچ پر اپنی جان دے دے مارتے تھے، مگر باوجود اس کے کامیاب نہ ہو سکتے تھے، دھاوا کرتے تھے اور بکھر جاتے تھے، کیوں کہ کم تھے لیکن سیستانی شیر کا جو رعب سب کے دلوں پر چھایا ہوا تھا کسی طرح باز نہ آتے تھے، لڑتے تھے، مرتے تھے، اور شیروں کی طرح بپھر بپھر کر جا پڑتے تھے۔

ہیموں ہوائی ہاتھی پر سوار، قلب لشکر کو سنبھالے کھڑا تھا، اور فوج کو لڑا رہا تھا۔ آخر کار میدان کا انداز دیکھ کر اس نے ہاتھی کھول دیے۔ کالے پہاڑوں نے اپنی جگہ سے جنبش کی اور کالی گھٹا کی طرح آئے اکبری نمک خوار خاطر میں نہ لائے بھاگے مگر ہوش و حواس سے، کالے پانی کے سیلاب کو رستہ دیا اور لڑتے بھڑتے ہٹتے چلے گئے، لڑائی کے وقت لشکر کا رخ اور دریا کا بہاؤ ایک حکم رکھتا ہے۔ جدھر کو پھر گیا، پھر گیا، غنیم کے ہاتھیوں کی صف بادشاہی فوج کے ایک پہلو کو ریلتی ہوئی لے گئی، خان زمان اپنی جگہ کھڑا تھا اور سپہ سالاری کی دوربین سے نظر دوڑا رہا تھا، اس نے دیکھا کہ سیاہ آندھی جو سامنے سے اٹھی برابر کو نکل گئی، اب ہیموں قلب لشکر کو لیے کھڑا ہے۔ یکبارگی فوج کو للکار کر حملہ کیا حریف ہاتھیوں کے حلقے میں تھا، اور گرد بہادر افغانوں کا غول تھا، اس نے پھر بھی حلقے ہی کو ریلا،

ترک تیروں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے بڑھے ، ادھر سے ہاتھی تلواریں سونڈھوں میں پھراتے اور زنجیریں جھلاتے آگے آئے۔ اس وقت علی قلی خاں آگے بیرم خانی جوان جاں فشانی کر رہے تھے جن میں حسین قلی خاں اس کا بھانجا سپہ سالار تھا ، اور شاہ قلی محرم وغیرہ مصاحب سردار تھے ، سچ یہ ہے کہ بڑا سا کھا کیا اور ہاتھیوں کے حملے کو حوصلے اور ہمت سے روکا ، وہ سینہ سپر ہو کر آگے بڑھے اور جب دیکھا کہ گھوڑے ہاتھیوں سے بدکتے ہیں تو کود پڑے اور تلواریں کھینچ کر صفوں میں گھس گئے انھوں نے تیروں کی بوچھاڑ سے سیاہ دیواروں کے منہ پھیر دیے اور کالے پہاڑوں کو خاک بنا دیا عجب گھمسان کا رن پڑا - ہیموں کی بہادری قابل تعریف ہے وہ ترازو باٹ کا اٹھانے والا ، دال چپاتی کھانے والا ہودے کے بیچ میں ننگے سر کھڑا تھا ، فوج کا دل بڑھاتا تھا اور فتح کا منتر جو کسی گیانی گنوان یا پنڈت بدیا دان نے بنایا تھا جپے جاتا تھا ۔ فتح شکست خدا کے اختیار ہے سپاہ کا ستھراؤ ہو گیا ، شادی خان افغان اس کے سرداروں کی ناک تھا کٹ کر خاک پر گر پڑا ، فوج اناج کے دانوں کی طرح کھنڈ گئی، پھر بھی اس نے ہمت نہ ہاری ہاتھی پر سوار چاروں طرف پھرتا تھا سرداروں کے نام لے لے کر پکارتا تھا کہ سمیٹ کر پھر جمع کر لے اتنے میں ایک قضا کا تیر اس کی بھینگی آنکھ میں ایسا لگا کہ باہر نکل گیا اس نے اپنے ہاتھ سے تیر کھینچ کر نکالا اور آنکھ پر رومال باندھ لیا ، مگر زخم سے ایسا بے قرار اور بے حواس ہوا کہ ہودے میں گر پڑا ۔ یہ دیکھ کر اس کے ہوا خواہوں کے جی چھوٹ گئے، سب تتر بتر ہو گئے ، اکبر کے اقبال اور خان زماں کی تلوار پر اس مہم کا فتح نامہ لکھا

گیا -"

لیکن آزاد کی ان سب بے احتیاطیوں کے باوجود بعض بعض مقامات پر ان کی اور شبلی کی سوچ کے ڈانڈے ایک مقام پر آ ملتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان دونوں کے نزدیک تاریخ نویسی کی مقتضیات اور ضروریات ایک ہی تھیں۔ شبلی کی طرح آزاد کا بھی یہی خیال تھا کہ سوانح نگاری ، تاریخ کی ایک شاخ ہے اور تاریخ غیر معمولی شخصیتوں کے حالات کے بیان کا دوسرا نام ہے ، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کسی زمانے یا کسی عہد کی کوئی باقاعدہ تاریخ لکھنے کے بجائے اس شوق کی تکمیل کے لیے اکبر کی سوانح لکھنے کو اپنایا اور شبلی کی طرح انھوں نے اکبر کے علاوہ اس کے زمانے کے حالات اور واقعات کے بیان کو بھی بے حد اہمیت دی ۔ یہ بات شبلی اور ان دونوں کے یہاں قدر مشترک ہے ۔ اسی طرح شبلی کی طرح انھوں نے بھی بقول خواجہ حسن نظامی :

"زمانے کی تاریخ کو صرف شاہی کارناموں تک محدود نہیں کیا بلکہ اس زمانے کے رسم و رواج ، طرز بود و ماند ، ملک کی عام حالت ، رعایا کی مرفہ الحالی اور دیگر حالات کا نقشہ کھینچ کر پڑھنے والے کو یہ یقین دلایا ہے کہ وہ اس زمانے میں زندگی بسر کر رہا ہے اور اپنی آنکھوں سے تمام حالات کا مشاہدہ کر رہا ہے[1] -"

لیکن ان سب باتوں کے باوجود جیسا کہ پہلے بھی بیان ہوا ہے اس بات سے کسی صورت انکار نہیں کیا جا سکتا کہ

---

۱ - خواجہ حسن نظامی : الناظر ، اکتوبر و نومبر ۱۹۱۶ء صفحہ ۱۲

"دربار اکبری" میں آزاد نے تاریخی تقاضوں سے زیادہ ادبی ضروریات کو پیش نظر رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی یہ کتاب تاریخی کتاب سے زیادہ ادبی معلوم ہوتی ہے۔ آزاد کے یہاں تاریخ اور ادب کے اس ملاپ کی نشان دہی دربار اکبری کی تعریف کرتے ہوئے حسن نظامی نے یوں کی ہے:

"یہ تاریخ کی کتاب بھی ہے اور ادب و انشا کا چمن بھی"[1]۔

بلا شبہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ آزاد کی یہ خوبی کہہ لیجیے یا خامی کہ انھوں نے تاریخ کی اس کتاب کو بھی ادبی نوعیت کی تصنیف بنا دیا ہے لیکن یہ کسی مورخ کے لیے تعریف کی بات نہیں۔ شبلی بھی ادیب تو ضرور ہیں لیکن انھوں نے اپنے اندر کے ادیب سے صرف وہیں کام لیا ہے جہاں اس کی ضرورت محسوس کی ہے۔ تاریخ لکھتے وقت وہ صرف اور صرف ایک مورخ رہے ہیں اور یہی بات ان کے آزاد سے بڑے مورخ ہونے کی دلیل ہے۔

آزاد کی طرح مولوی چراغ علی بھی ایسے مؤرخ ہیں جنھیں ان کی صرف ایک ہی تصنیف نے مؤرخوں کی محفل میں جگہ دلا دی ہے۔

سرسید نے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تو اپنی آواز دور دور تک پہنچانے کے لیے ایک رسالے کی ضرورت محسوس کی چنانچہ انگریزی رسالوں ٹیٹلر اور اسپیکٹیٹر کی طرز پر تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ اس رسالے میں جہاں انھوں نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے خود مضامین لکھے وہاں اپنے گرد بہت سے ایسے ساتھی جمع کر لیے جو اس کام میں ان کا ہاتھ بٹا سکتے، انھیں میں سے ایک مولوی چراغ علی تھے۔

۱۔ خواجہ حسن نظامی، الناظر، اکتوبر و نومبر ۱۹۱۶ع صفحہ ۱۲

مولوی صاحب کی تقریباً سبھی تصانیف کا موضوع مذہب ہے، پھر بھلا یہ کیسے ہوتا کہ وہ تاریخ لکھنے بیٹھتے اور مذہب سے اس کا کوئی تعلق پیدا نہ ہوتا - انھوں نے موضوع چنا بھی تو ایسا جو سراسر مذہبی تھا یعنی "قدیم قوموں کی مختصر تاریخ -" اس کتاب میں ان قدیم اقوام کا ذکر کیا گیا ہے جن کا ذکر قران کریم میں ہے، اس کے علاوہ اس کتاب میں عیسائیوں کے اس اعتراض کا نہایت تحقیق و استدلال سے جواب دیا گیا ہے کہ قران کی مذکورہ اقوام کا وجود کبھی نہ تھا -

مولوی چراغ علی سرسید کے ہر قول و فعل کی پیروی کو اپنا مذہبی فرض جانتے تھے چنانچہ ان کی کوئی بھی تصنیف اٹھا کر دیکھ لیجیے اس میں پس پردہ ہمیشہ سرسید کی جھلک نظر آئے گی - مؤرخ کی حیثیت سے بھی مولوی صاحب نے انہی اصولوں پر عمل پیرا ہونا ضروری سمجھا جو سرسید اپنے نزدیک تاریخ نویسی کے لیے ضروری سمجھتے تھے - چنانچہ ان کی تاریخ میں بھی سرسید کی طرح ہر مضمون کو دلائل سے مضبوط کر کے صحیح یا غلط ثابت کیا جاتا ہے، طریقۂ استدلال وہی سرسید والا ہے یعنی ان کے یہاں بھی دلائل کی بھرمار کہیں کہیں اس منزل پر جا پہنچتی ہے جہاں سے تاویل گری کی ابتدا ہوتی ہے - شبلی کے یہاں یہ بات نہیں وہ جو کچھ کہتے ہیں نہایت تحقیق سے کہتے ہیں - کسی موضوع پر لکھتے ہوئے حتی الامکان ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اس موضوع پر لکھی جانے والی ہر چیز پہلے دیکھ لیں پھر قلم اٹھائیں، اس محنت و جستجو کے بعد شبلی کو اس بات کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ وہ تاویلوں کا سہارا

ہیں - مؤرخ سرسید کو یہی بات مؤرخ شبلی سے جدا کرتی ہے اور یہی بات مؤرخ شبلی اور مؤرخ چراغ علی کے درمیان حدِ فاصل ہے ۔

مولوی چراغ علی کی دوسری تصانیف کی طرح "قدیم قوموں کی مختصر تاریخ" میں بھی مولوی صاحب کا یہی انداز ہے کہ وہ اِدھر اُدھر کی باتوں میں نہیں الجھتے بلکہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں ، یہ بات شبلی کو بھی پسند ہے لیکن وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ایک ہی موضوع پر مستقل بات چیت کرتے رہنے سے طبیعت کچھ اکتا سی جاتی ہے چنانچہ وہ اپنی تاریخ میں بعض بعض جگہ ، حسبِ موقع دلچسپ قصے بھی بیان کرتے جاتے ہیں - اس معاملے میں مولوی چراغ علی ، شبلی کے معتقد نہیں سرسید کے مقلد ہیں ، انہیں دلچسپی کی کسی بات سے تعلق نہیں ہوتا بلکہ صرف اپنی بات منوانے سے غرض ہوتی ہے ، کوئی کچھ ہی کہتا پھرے وہ سنی ان سنی کر کے برابر استدلال سے اپنا نقطۂ نظر ثابت کرنے میں مصروف رہتے ہیں - اس چیز نے اُن کی عبارت میں بھی سرسید کی طرح بےکیفی پیدا کردی ہے ، دوسری طرف شبلی کے یہاں عبارت میں رنگینی تو نہیں لیکن دلکشی ضرور ہے -

شبلی کے اکابر معاصرین میں نذیر احمد اپنے مختارات کی وجہ سے بڑی عزت اور منزلت سے دیکھے جاتے ہیں - وہ اردو کے عناصر خمسہ میں سے ہیں - اردو میں ناول نویسی کی بنیاد انہی کے ہاتھوں رکھی گئی - کئی ناولوں اور مختلف موضوعات پر دوسری مستقل تصانیف سے قطع نظر تاریخ سے متعلق بھی تین تصانیف اُن کی یادگار ہیں - ایک "تاریخ دربار تاج پوشی" دوسری "کرشمہ اتحاد" اور تیسری "مصائب غدر۔"

لیکن یہ تینوں ان کی طبع زاد تصانیف نہیں بلکہ تراجم ہیں -

جیسا کہ ابھی بیان ہوا نذیر احمد اردو ناول کے باوا آدم ہیں ، انہیں اپنی اس اولاد سے بے پناہ محبت ہے اور یہی محبت اور لگاؤ ہے جو انھیں ہر آس منزل اور ہر آس مقام سے ہٹا کر جو ناول نویسی کی ضروریات اور مقتضیات سے الگ ہو ، دوبارہ ناول نویسی کی حدود اور میدان اختیار میں لے آتا ہے - یہ ٹھیک ہے کہ وہ اول و آخر ایک ناول نویس ہیں لیکن وہ شرر کی طرح کے ناول نگار نہیں کہ اس کی خاطر اپنے عقائد اور حقائق کو خیر باد کہہ دیں ، وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں اس سے پوری طرح انصاف کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اسے کیا کیا جائے کہ دہلی کے روزمرہ اور محاورہ کا استعمال ان کی کمزوری ہے ، اس کمزوری نے ان کے یہاں یہ خامی پیدا کر دی ہے کہ کہیں کہیں وہ محاوروں کی تلاش میں صحیح راہ چھوڑ کر کہیں اور نکل جاتے ہے -

اسی موقع کے لیے مولانا حامد حسن قادری نے کہا ہے : "نذیراحمد نے اپنی کتابیں مورخ و سیرت نگار کی حیثیت سے نہیں لکھیں بلکہ ادیب و انشا پرداز کی حیثیت کو پیش نظر رکھا ہے[1] -" شبلی کی تاریخ میں ایسی کوئی بات نہیں وہ انشا پرداز تو ضرور ہیں لیکن انشا پردازی آن پر غالب نہیں - عبارت کو سجانے کے لیے وہ نذیر احمد کی طرح تاریخ نویسی کے اصولوں کو قربان نہیں کرتے -

لیکن اس سے میری مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ شبلی نے انشاپرداز ہونے کے باوجود کہیں بھی انشا پردازی سے کام نہیں لیا - وہ

---

۱ - حامد حسن قادری ، داستان تاریخ اردو صفحہ ۳۸۱

بلا شبہ اور بہت کچھ ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ انشا پرداز بھی تھے۔ ان کے مزاج کو انشا پردازی سے بے پناہ مناسبت تھی لیکن انھوں نے اپنے مزاج کی اس خصوصیت کو کہیں بھی اس ضرورت پر فوقیت حاصل نہیں ہونے دی جو عین مقصود ہو۔ چنانچہ انھوں نے اگر کہیں شاعری کی ہے تو اپنی شخصیت کے جملہ پہلوؤں پر صرف شاعر کو فوقیت دی ہے۔ کہیں سوانح نویسی کی ہے تو اپنی جملہ حیثیات پر صرف سوانح نگار کو مقدم جانا ہے اور کہیں نقاد کی حیثیت سے قلم اٹھایا ہے تو اپنی شخصیت کے گونا گوں پہلوؤں کو نقاد شبلی کے مقابلے میں ثانوی حیثیت دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہ یک وقت ایک انشا پرداز، ایک شاعر، ایک سوانح نگار، ایک مؤرخ، ایک متکلم، ایک نقاد اور ایک محقق ہونے کے باوجود ان کے یہاں کہیں ان کی شخصیت کے یہ سب پہلو ایک دوسرے میں خلط ملط نہیں ہوئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مختلف موقعوں اور مختلف موڑوں پر ان کا ساتھ ضرور ہوا ہے لیکن شبلی نے ان سب کا حلقۂ عمل مقرر کر رکھا ہے۔ اگر کوئی کسی دوسرے کے دائرۂ اختیار اور حلقۂ اقتدار میں داخل ہوتا بھی ہے تو اسے صاحب اقتدار کے حکم پر چلنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وقتاً فوقتاً شبلی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی آپس میں ملاقات اور ساتھ ہو جانے کے باوجود ان میں رد عمل کی کیفیت نہیں پیدا ہوتی۔

شبلی صرف وہیں تک انھیں ایک دوسرے کے حلقۂ اقتدار میں آنے کی اجازت دیتے ہیں جہاں تک آگے بڑھنے کی گنجائش ہو۔ اسی لیے مختلف موقعوں پر ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا اور ایسے پہلوؤں کا جن کا فنی اعتبار سے آپس میں کوئی

تعلق نہیں ساتھ ہو جانے کے باوجود کہیں ایسی کیفیت پیدا نہیں ہوئی کہ ان میں رسہ کشی کی نوبت آئی ہو۔ ان کی شخصیت کے مختلف پہلو ایک دوسرے کے کام میں روڑے نہیں اٹکاتے بلکہ ایک دوسرے کا اس کے کام میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں بہت کم ایسا ہوا ہے کہ ان کی شخصیت کے کسی ایک پہلو نے ان کے فن کے کسی دوسرے پہلو کو ٹھیس پہنچائی ہو۔ دوسری طرف نذیر احمد کے یہاں یہ بات تو ہے اور بڑی خوبی کی بات ہے کہ انھوں نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا کہیں ٹکراؤ نہ ہو اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی رہے ہیں چنانچہ اپنی طبیعت کا میلان ناول نویسی کی طرف مائل ہونے کے باوجود انھوں نے اس میں خاصی کامیابی بھی حاصل کی ہے اور اپنے ان کارناموں میں جن کا تعلق تاریخ سے ہے کہیں بھی اپنے اندر کے ناول نویس کے مزاج کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ لیکن اسے کیا کیا جائے کہ ان کی شخصیت کے مختلف پہلو پوری طرح ان کے قابو میں نہیں، وہ برابر اس جستجو میں رہتے ہیں کہ کسی طرح مولوی صاحب کی نظر بچا کر ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دیں، اسی چھیڑ چھاڑ کی کوشش میں بعض اوقات وہ مولوی صاحب سے چھپتے چھپاتے اپنے حلقوں سے نکلنے اور دوسروں کے معاملات میں مداخلت کرنے کا باعث بھی بنتے ہیں۔ چنانچہ کئی موقعوں پر ایسا ہوا ہے کہ انشا پرداز نذیر احمد مولوی صاحب کی جملہ حیثیات پر فوقیت حاصل کر کے ان سے متعلق دوسرے فنون کے فنی تقاضوں کو ٹھیس پہنچانے کا باعث بنا ہے۔

محاوروں کا بلا ضرورت اور بے جا استعمال جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے مولوی نذیر احمد ، جان بوجھ کر نہیں کرتے ۔ وہ عادت سے مجبور ہیں اسی وجہ سے جگہ جگہ وہ اس کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں کہ اپنی لکھی ہوئی عبارت میں سنجیدگی اور متانت قائم رکھیں لیکن ان کی ایک اور عادت بلائے جان ہو جاتی ہے ، وہ فطرتاً ظریف ہیں ، موقع کیسا ہی ہو وہ اپنا شوق پورا کرنے کی گنجائش نکال لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی تاریخ سے متعلق تینوں کتابیں تراجم ہونے کے باوجود ان کے مزاج کی ظرافت اور شوخی سے مرصع ہیں ۔ ان کے مزاج کی یہی شوخی اور ظرافت انہیں کبھی کبھی نہیں بلکہ اکثر و بیشتر فن تاریخ نویسی سے ہٹنے پر مجبور کر دیتی ہے ۔ یہ شوخی اور ظرافت ناول نویسی کے لیے تو یقیناً موزوں ہے لیکن تاریخ اور اس کا جوڑ کچھ بے میل سا ہو جاتا ہے ۔ شبلی کے یہاں ایسی کوئی خامی نہیں وہ تاریخ کے اصولوں کو چھوڑ کر محض ظرافت پیدا کرنے کے لیے مطلب کی بات سے نہیں ہٹتے ، کبھی کبھی ان کے لبوں پر تبسم ضرور مچلنے لگتا ہے لیکن وہ نذیر احمد کی طرح اس کے درپے نہیں رہتے ۔

مؤرخ شبلی اور مؤرخ نذیر احمد کو ایک اور بات بھی جدا کرتی ہے ۔ تاریخ نویسی کے بارے میں ان کے چند نظریات ہیں مثلاً شبلی تاریخ نویسی کے لیے بادشاہ کی تخت نشینی کے حالات اور جنگ و تفنگ کے قصوں کے بیان کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں لیکن نذیر احمد کے نزدیک تاریخ نویسی کی انتہا کا راز صرف اور صرف انہی کے بیان میں مضمر ہے ۔ تاریخ سے متعلق جو تصانیف انھوں نے ترجمے کے لیے منتخب کیں وہ اس کی واضح مثال ہیں ۔

چنانچہ ترجمہ کے لیے ان کی انتخاب کردہ تصانیف میں سے دو یعنی "مصائب غدر" اور "تاریخ دربار تاج پوشی" کا موضوع کلیتاً اور صریحاً یہی ہے۔ اول الذکر کتاب یعنی "مصائب غدر" ولیم ایڈ ورڈس (William Edwards) کی آپ بیتی ہے جو اس نے روز نامچے کی شکل میں ۱۸۵۷ع کے واقعات کے بارے میں قلمبند کی۔ اس کتاب میں ولیم ایڈورڈس نے پہلی جون ۱۸۵۷ع سے لے کر ۳۰ اگست ۱۸۵۷ع تک کے حالات لکھے ہیں۔ جہاں یہ تصنیف جنگ و تفنگ اور تاریخ نویسی کے رشتے کی اہمیت اور قریبی تعلق کے بارے میں مولوی نذیر احمد کے خیالات کی نشان دہی کرتی ہے وہاں اسے دیکھتے ہوئے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ تاریخ نویسی کے معاملے میں شبلی کی طرح نذیر احمد بھی مورخ کی غیر جانبداری کے بے حد قائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ترجمے کے لیے اس کتاب کا انتخاب کیا حالانکہ موقع محل کی نزاکت کے اعتبار سے اس کا ترجمہ مسلمانوں کے لیے بے حد مضر تھا۔

یہ زمانہ، غدر کا زمانہ ہے کہ اس زمانے میں ایک طرف تو انگریز حکمران جنگِ آزادی کا ذمہ دار کلیتاً مسلمانوں کو ٹھیراتے ہوئے برابر انھیں اپنے مظالم کا نشانہ بنا رہے تھے اور دوسری طرف ہندو اہلِ وطن مسلسل اس کوشش میں تھے کہ وہ کسی طرح اپنے پر سے غداری کا وہ الزام صاف کرادیں جو نئے حکمران، مسلمانوں کے ساتھ ساتھ کسی حد تک ان پر بھی لگاتے تھے۔ اہل ہنود کے نزدیک نئے حکمرانوں سے قرابت بڑھانے کی یہی ایک صورت تھی۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مصائب غدر کا موضوع مسلمانوں کے مفاد کے بجائے

ہنود کے مفاد کے بہت زیادہ قریب تھا کیوں کہ اس میں ایک انگریز کے قلم سے جنگ آزادی کے دوران میں ہندوؤں کی وفاداری کا بیان قلمبند ہوا ہے ۔ اس مثال کو میراث بنا کر جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نذیر احمد مورخ کی غیر جانبداری کے بے حد قائل تھے اور وہ کسی بات کو محض اس بنیاد پر نظرانداز کرنے کے لیے ہر گز تیار نہ تھے کہ وہ ان کے سیاسی مسلک کے خلاف تھی ۔ جہاں تک تاریخ نویسی کے فن کا تعلق ہے شبلی اور ان کے یہاں یہ بات قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے ، کیوں کہ شبلی بھی ہمیشہ تاریخ نویسی کی جملہ لوازمات پر غیرجانبداری کو اہمیت اور فوقیت دیتے تھے لیکن جہاں تک سیاسی ضرورت کا تعلق ہے یہ بات شبلی اور نذیر احمد کے درمیان حد فاصل ٹھیرائی جا سکتی ہے کیوں کہ شبلی کی تاریخ نویسی کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ وہ جنگ آزادی کے شکست خوردہ مسلمانوں کے دلوں سے احساس کمتری دور کر کے انھیں ان کے پاؤں پر کھڑا کریں اور دوسری طرف نذیر احمد اس معاملے میں ہندوؤں کا ساتھ دے رہے تھے۔ ظاہر ہے اگر اس بات کو سیاسی اعتبار سے پرکھا جائے تو یہ شبلی کے مسلک کے قطعاً خلاف تھی لیکن جہاں تک تاریخ نویسی کے فن کا تعلق ہے یہ ان دونوں میں قدر مشترک ہی نہیں باعث اشتراک بھی تھی ۔

ان سب باتوں کو رکھیے ایک طرف کہ انھیں نذیر احمد کے یہاں ثانوی حیثیت دی گئی ہے ۔ ترجمے کے لیے "مصائب غدر" کے چناؤ کی اصل وجہ جیسا کہ ابھی بیان ہوا محض یہ تھی کہ نذیر احمد تاریخ کو صرف اور صرف جنگ و تفنگ کے حالات کے بیان اور ارباب سلطنت کے حالات کے ذکر تک

محدود سمجھتے تھے۔ ترجمہ کے لیے تاریخ سے متعلق ان کی منتخب کردہ دوسری کتاب ''تاریخ دربار تاجپوشی'' بھی اس اعتبار سے انھیں تاریخ نویسی کا عین مقصود و معیار معلوم ہوئی کہ اس کا تعلق بھی ایک بادشاہ کی تخت نشینی کے واقعات سے تھا۔ اس کتاب میں ایڈورڈ ہفتم کے جشن تخت نشینی کا حال درج ہے۔ یہ جشن ۱۹۰۳ع میں پہلی جنوری کو منعقد ہوا۔ انگریزی میں گورنر جنرل کے حسب الحکم اس جشن کی روداد سراسٹیفن وھیلر نے مرتب کی تھی جسے اردو کے قالب میں نذیر احمد نے ڈھالا۔

اس کتاب کا ابتدائی حصہ ملکہ وکٹوریہ کی وفات، ایڈورڈ ہفتم کی تخت نشینی اور مغربی منسٹر کے جلسہ تاج پوشی کے حالات کے بیان پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصوں میں دربار دہلی کے مدعوئین کا ذکر، وائسرائے کی فرودگاہ، ہندوستانی صنعت و حرفت کی نمائش، شاہی دربار کا نقشہ، وائسرائے کی تقریر، بادشاہ کا پیغام، شاہی دعوت، رقص و سرود کے جلوس اور تقسیم انعامات و خطابات کے حالات کا بیان اور جشن کی دوسری تقریبات کا ذکر شامل ہے۔ اس اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو شبلی اور نذیر احمد کہیں کہیں جدا جدا راہوں پر گامزن دکھائی دیتے ہیں۔

اردو کے مؤرخین کی محفل میں سید علی بلگرامی کا نام بھی بڑے زور شور سے لیا جاتا ہے۔ یوں تو ان کے قلم نے اردو کو تاریخ سے متعلق کوئی تصنیف نہیں دی لیکن انھوں نے ''تمدن عرب'' اور ''تمدن ہند'' کے نام سے فرانسیسی مؤرخ لی بان، کی دو تصانیف کا ایسا عمدہ ترجمہ کیا ہے کہ انھیں ان دو کتابوں کے حوالے سے اردو کے مورخین کی محفل میں

بیٹھنے کی سند حاصل ہو گئی ۔

ایک عرصے تک اردو کیا ، ہر زبان میں سلاطین کے درباروں اور رنگ رلیوں کے ذکر اور جنگوں اور لڑائیوں کے بیان کو تاریخ سمجھا جاتا تھا لیکن آج تاریخ کے معنی بہت کچھ تبدیل اور وسیع ہو گئے ہیں ۔ آج تاریخ صرف ان میدانوں تک محدود نہیں رہی بلکہ یہاں سے نکل کر بہت دور تک جا پہنچی ہے ۔

اب تاریخ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ زندگی بسر کرنے کا بہتر سے بہتر طریقہ بتاتی ہے ۔ یہ بات کچھ دل لگتی معلوم ہوتی ہے لیکن اس صورت میں نہیں کہی جاسکتی جب کہ اسے چند اشخاص کے ذکر اور لڑائی میں فوجوں کی تعداد ، کارناموں اور ان سے متعلق دوسری تفاصیل تک محدود کر دیا جائے ، کیونکہ ایسے واقعات دلچسپ تو ضرور ہوتے ہیں لیکن ترقی کی کوئی نئی راہ نہیں دکھاتے ۔ بھلا اس سے کسی کو کیا غرض ہوگی کہ ایک بادشاہ نے دوسرے سے کیوں جنگ کی اور ان دونوں میں حق بجانب کون تھا ؟ یا یہ کہ فلاں فوج میں اتنے پیادہ سپاہی تھے اتنے گھوڑ سوار اور اتنے فیل سوار ۔ البتہ کسی زمانے میں اس تفصیل سے ضرور فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا کہ کسی فوج کو کن ہتھیاروں اور حربوں کے استعمال کرنے سے فتح حاصل ہوئی اور دوسری فوج کی شکست کی کیا وجوہ تھیں لیکن آج یہ تفصیل بھی کسی کام نہیں آتی ، اب نہ جنگ کے وہ طریقے ہیں نہ وہ ہتھیار ، جو چیز آج نئی ہوتی ہے کل پرانی ہو جاتی ہے ۔ پھر بھلا اس قسم کی تفصیل کا فائدہ ؟

دراصل صحیح تاریخ وہ ہے جو ہمیں یہ بتائے کہ کوئی قوم کس طرح پیدا ہوئی اور کس طرح وہ بچپن سے لے کر

بڑھاپے تک کے مرحلوں ، امتحانوں اور آزمائشوں سے گزری ۔ یہ مقصد محض ارکان سلطنت کے اوصاف و کمالات بیان کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ اسے پانے کے لیے نظم و نسق ، جن میں حکمران طبقے کے فرائض بھی شامل ہیں ، ملکی قوانین رسم و رواج ، مختلف پیشے ، فنون لطیفہ اور اخلاقی و عملی زندگی اور میلانات کا ذکر بھی ضروری ہے ۔ ان کے ذکر کے بغیر تاریخ قصہ بن کر رہ جاتی ہے جو وقتی طور پر انبساط خاطر کا ذریعہ تو بن سکتی ہے لیکن قلب و نظر کو جلا نہیں بخش سکتی ۔ اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر بہت کم لوگوں نے تاریخ لکھی ہے انھی معدودے چند لوگوں میں ایک لی بان ہیں جن کی دو تصانیف کا ترجمہ سید علی بلگرامی نے کیا ہے ۔

شبلی اردو میں پہلے مؤرخ ہیں جنھوں نے مندرجہ بالا اصولوں کو اپنایا لیکن سید علی بلگرامی کی خدمت بھی اس لحاظ سے بھلائی نہیں جا سکتی کہ انھوں نے لی بان کی دونوں تصانیف کا ترجمہ کرکے تاریخ نگاری کے اچھے اور معتبر اصولوں کی نشان دہی کی لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ دونوں تصانیف سید علی بلگرامی کے زور قلم کا نتیجہ نہیں ۔ مترجم کے لیے یہ ڑی مشکل ہوتی ہے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتا ۔ وں سمجھ لیجیے کہ وہ ایک ایسے نام نہاد ملزم کی طرح ہوتا ہے سے گرفتار کرنے کے بعد رسیوں سے جکڑ کر اس سے اپنی ماضی کا بیان دلایا جا رہا ہو ۔ اکبر کا یہ شعر اس صورت حال صحیح ترجمانی کرتا ہے :

فقط مرا ہاتھ چل رہا ہے　　انھیں کا مطلب نکل رہا ہے
نھیں کا مضموں انھیں کا کاغذ　　قلم انھیں کا ، دوات ان کی

مثال کے طور پر تمدن عرب سے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے بات واضح ہو جائے گی کہ کس طرح مترجم غلط باتوں کو بھی قبول کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

لی بان نے ''تمدن عرب'' اور ''تمدن ہند'' دونوں میں خاصی غیر جانب داری سے کام لیا ہے لیکن کہیں کہیں وہ غیر مسلم ہونے کی بنا پر اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں ایسی باتیں کہہ جاتا ہے جو کسی طرح بھی درست نہیں، مثلاً ایک جگہ رسول کریم کے بارے میں لکھتا ہے: ''اگر حضرت میں کسی قسم کا نقص تھا تو وہ عورتوں کی محبت کا تھا.................... حضرت کی رغبت نسواں اس درجہ تھی کہ ایک روز اتفاقاً اپنے متبنٰی بیٹے زید کی بی بی کو بلایا، لباس دیکھ کر حضرت نے اس کی اس قدر خواہش کی کہ زید کو ضرور بن پڑا کہ اپنی زوجہ کو طلاق دے[1]۔''

اسی طرح ایک اور جگہ لکھتے ہیں: ''آپ نبی امی تھے اور یہ قرین قیاس ہے کہ اگر آپ عالم ہوتے تو شاید قرآن میں مضامین کا سلسلہ کسی قدر بہتر ہوتا[2]۔''

یہ دونوں باتیں قطعاً غلط اور غیر منصفانہ تاویل کا نتیجہ ہیں لیکن سید علی بلگرامی نے کڑوے گھونٹ کی طرح انھیں بھی پی لیا صرف اس لیے کہ وہ مترجم تھے[3]۔

---

۱ - سید علی بلگرامی، تمدن عرب، صفحہ ۱۸۹

۲ - ایضاً صفحہ ۱۸۸

۳ - مترجم کی ان ہی مصیبتوں اور مجبوریوں کو دیکھتے ہوئے میں نے نذیر احمد اور سید علی بلگرامی کے علاوہ کسی دوسرے مترجم کا ذکر نہیں کیا۔

ان حالات میں سید علی بلگرامی اور شبلی کا موازنہ نہیں کیا جا سکتا - جہاں تک دونوں کے انداز تحریر کا تعلق ہے اس کا مقابلہ البتہ ہو سکتا ہے -

شبلی کا انداز تحریر نہایت سادہ اور تاریخ نویسی کے اصولوں کے عین مطابق ہے ، سادگی کے باوجود اس میں شگفتگی قائم رہتی ہے اس کے برعکس سید علی بلگرامی کے یہاں شگفتگی نام کو نہیں البتہ بیان میں سادگی ضرور ہے -

اردو کے مؤرخین میں ایک اور اہم نام ''مولانا عبدالحلیم شرر'' کا ہے - ان کی تصانیف کا بنیادی جذبہ بھی اسلام کے شاندار ماضی کا احیاء اور عیسائیت کے مقابلے میں اسلام کی برتری کا اظہار ہے - شبلی کی طرح یہ بھی اسلام کی عظمت کے گیت گاتے ہیں لیکن ان کے گیت شبلی کے گیتوں سے بہت مختلف ہیں ، شبلی کے ہر گیت کی لے سے مسلمانوں کی عظمت اور شہامت کی آواز پھوٹتی سنائی دیتی ہے اور شرر کی ہر لے میں رنج و غم کی پکار ہے - شبلی مسلمانوں کی گذشتہ عظمت کے مدح خواں ہیں اور شرر مرثیہ خواں -

شبلی کی طرح تاریخ نویسی کے چند اصول ان کے بھی پیشِ نظر رہتے ہیں - جو ان کے رہنما اور کسی حد تک ہر وقت کے ساتھی ہیں - شرر شبلی کی طرح تاریخ نویسی میں غیرجانبداری اور سچائی کے قائل ہیں، شبلی نے ایک جگہ سچائی اور غیر جانبداری کو مذہب پر فوقیت دیتے ہوئے کہا تھا کہ اگر سچ بات کہنے کے لیے مذہب کی قربانی بھی دینی پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں - کچھ اس سے ملتے جلتے خیالات مولانا شرر کے بھی ہیں ، وہ ایک جگہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں : "ہم

چاہتے ہیں کہ اسلام میں مختلف عقائد کے ظہور اور مذاہب کے پولیٹکل تغیرات و انقلابات پر ایک مفصل اور کسی قدر ضخیم کتاب لکھی جائے جس میں تعصب کو دخل نہ ہو اور آزادی و انصاف پسندی سے ہر فرقے کے حالات درج ہوں[1] ۔"

لیکن شرر کے یہ خیالات صرف کہنے کی حد تک ہیں عملی طور پر وہ غیر جانبدار مؤرخ نہیں ہیں البتہ انہیں غیر متعصب ضرور کہا جا سکتا ہے ۔ تعصب کی وجہ سے وہ نہ تو کسی پہ چھینٹیں اچھالتے ہیں اور نہ آوازے کستے ہیں بلکہ جہاں موقع ہو وہاں غیر مذاہب کی تعریف و توصیف کرنے میں بھی جھجک محسوس نہیں کرتے ۔ شرر کی بے تعصبی اس حد تک جا پہنچی ہے کہ وہ متعصب شخص کو مؤرخ ہی نہیں مانتے ، ایک جگہ کسی کے تعصب کا گلہ یوں کرتے ہیں : "وہ تعصبات کے رنگ میں اس قدر رنگے ہوئے ہیں کہ تاریخی اعتبار کے درجے سے بالکل ساقط ہیں[2] ۔"

اُن کی بے تعصبی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے "تاریخ ارض مقدس" کے نام سے حضرت مسیح اور دینِ مسیحی کی ایک پوری تاریخ لکھی ہے ۔ جس میں نہ کہیں اس مذہب کی برائی ہے ، نہ کہیں اس کے ماننے والوں کی ، البتہ کہیں کہیں جہاں انہیں عیسائیوں میں کوئی خامی دکھائی دی ہے اس کا اظہار ضرور کر دیا ہے لیکن یہ تعصب کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ سچائی کا تقاضا ہی یہ تھا ۔

ان سب باتوں کے باوجود ماننے کی بات یہ ہے کہ شرر

---

۱ ۔ عبدالحلیم شرر ، حسن بن صباح صفحہ ٦٨

۲ ۔ ایضاً ، تاریخ ارض مقدس صفحہ ١٠

اچھے مؤرخ نہیں ، وہ تاریخ نویسی کے اصولوں کا ذکر تو کرتے ہیں ، انھیں نبھا نہیں سکتے ۔ ان کا مزاج ایک مؤرخ کا نہیں بلکہ ناول نگار کا مزاج ہے ۔ اس لیے ان کی نگاہیں برابر ایسے واقعات کی تلاش میں رہتی ہیں جن میں قصہ بننے کی ذرا بھی گنجائش ہو ۔ وہ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے حقیقت کو حقیقت سے دور اور ناول کی کہانی سے قریب لے جاتے ہیں ۔

اس بات نے ان کی لکھی ہوئی تاریخوں میں کئی خامیاں پیدا کر دی ہیں مثلاً قصے میں روانی اور تسلسل پیدا کرنے کے لیے وہ تاریخ نویسی کے ایک اہم اصول بلکہ یوں کہیے کہ تاریخ نویسی کی ایک اہم ضرورت کو نظر انداز کر جاتے ہیں یعنی وہ سنہ اور تاریخ لکھنے کا تکلف صرف کبھی کبھی کرتے ہیں ۔

اس کے علاوہ اس شوق کی تکمیل نے ان کی زبان اور اندازِ بیان کو بھی شاعرانہ بنا دیا ہے جو تاریخ نویسی کے لیے کسی طرح موزوں نہیں ۔ شاعرانہ اندازِ بیان اور الفاظ و محاورے کی تلاش انھیں تاریخ نویسی کے کوچے سے نکال کر کہیں اور لے جاتی ہے ۔ شبلی کے یہاں ان کے انشاء پرداز ہونے کے باوجود یہ خامی نہیں ۔

ایک اور بات جو مؤرخ شبلی کو شرر سے جدا کرتی ہے یہ ہے کہ شبلی تاریخ لکھتے وقت صرف مؤرخ ہوتے ہیں اور اپنی شخصیت کی جملہ حیثیتوں یعنی متکلم شبلی ، شاعر شبلی ، انشاء پرداز شبلی اور نقاد شبلی سب کو بھول جاتے ہیں ۔ دوسری طرف شرر ، ناول نگار شرر کو مؤرخ شرر پر فوقیت دیتے ہیں ۔ ان کے نزدیک ناول نگاری ، تاریخ نویسی سے زیادہ

مقدم ہے - پروفیسر سید وقار عظیم نے ایک جگہ کہا ہے :
"تاریخ کا نقطۂ نظر عام انسانی نقطۂ نظر سے مختلف اور درد مندی اور سوز و گداز سے خالی ہوتا ہے ، مؤرخ کی نظر صرف شاہوں اور کج کلاہوں پر پڑتی ہے بندگانِ کوچہ گرد کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں اس لیے تاریخ کے اوراق ان کے ذکر سے خالی ہیں ، اس کا روایت پسند ذہن صداقت کے مقابلے میں روایت کو غیر معتبر سمجھ کر رد کردیتا ہے اور اس طرح اپنے سینے کو رومان کے ایک مستقل خزانے سے خالی رکھتا ہے[1] -"

پروفیسر سید وقار عظیم نے ایک اور جگہ تاریخ نویسی کی اسی خامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "علمی مؤرخ نے اکثر تاریخ کے دلچسپ ترین اور اہم ترین واقعات کی طرف سے اغماض برتا ہے - یہاں اہم ترین واقعات سے مراد وہ واقعات ہیں جو مؤرخ کو تو اہم نہیں معلوم ہوتے لیکن اپنی اثر انگیزی کے اعتبار سے دلچسپ بھی ہوتے ہیں اور اہم بھی - اسی طرح کے واقعات کی کمی یا زندگی کے ایسے پہلوؤں اور طبقوں اور اشخاص کی طرف سے بے اعتنائی کی بدولت تاریخ نہ صرف غیر دلچسپ بن جاتی ہے بلکہ سچائی یا حقیقت کی مکمل تصویر بنانے اور اس طرح ماضی کو ایک نئی زندگی دینے سے قاصر رہتی ہے[2] -"

شرر مؤرخ کی نگاہ سے چھپے ہوئے ایسے ہی رومانی حقائق کی تلاش میں نکل جاتے ہیں اور یہ تلاش و جستجو انھیں

---

۱ - پروفیسر وقار عظیم ، فن اور فن کار صفحہ ۵
۲ - ایضاً صفحہ ۷

مورخ کی دنیا سے بہت دور لے جا کر ، قصہ گو کی دنیا میں پہنچا دیتی ہے ، لیکن شبلی کے یہاں ایسا نہیں ہوتا ۔ وہ بھی حالانکہ شاعر ہیں اور ایسے شاعر جن کی رومانیت کو بعض نقادوں نے طنز و تشنیع کا نشانہ بھی بنایا ہے ، لیکن یہ رومان پسندی نہیں ادھر آدھر بھٹکاتی نہیں پھرتی ۔ وہ اسی ڈگر پر چلتے ہیں جو مؤرخ کے نزدیک نہایت پسندیدہ اور ناول نگار کے نزدیک نہایت فرسودہ ہے ۔

نظریاتی اعتبار سے آردو کے مؤرخوں میں ، ''البرا مکہ'' والے عبدالرزاق کانپوری شبلی سے قریب تر ہیں ۔ تاریخ کے معاملے میں شبلی کی طرح وہ بھی کارلائل کے اس نظریے کے حامی تھے کہ غیر معمولی شخصیتوں کے غیر مختتم سلسلے کا نام تاریخ ہے ۔ چنانچہ انھوں نے بھی تاریخ نویسی کے لیے سوانح نگاری کو وسیلۂ اظہار بنایا ۔ وہ سوانح نگاری کو تاریخ کا ایک شعبہ سمجھتے تھے ، جس کا اظہار انھوں نے ایک جگہ خود بھی کیا ہے ، لکھتے ہیں : ایک شعبہ تاریخ کا تذکرہ ہے جس کو یونانی میں بیو گرفی ، انگریزی میں لائف ، عربی میں سیرت ، اردو میں سوانح عمری کہتے ہیں' ۔'' ان کے یہاں بھی تاریخ نویسی اور سوانح نگاری کے درمیان فاصلے اتنے کم رہ جاتے ہیں کہ یہ فاصلے ، فاصلے نہیں معلوم ہوتے ۔

تاریخ نویسی شروع کرتے وقت شبلی کے پیشِ نظر جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو ان کے بزرگوں کے کارہائے نمایاں سنا کر اس

---

۱ ۔ محمد عبدالرزاق کانپوری ، البرامکہ صفحہ ۳۵

احساس کمتری سے بچایا جائے جس میں وہ جنگِ آزادی میں شکست کھانے کے بعد مبتلا ہو گئے تھے ۔ تاریخ لکھتے وقت عبدالرزاق کانپوری کے سامنے بھی یہی مقصد تھا ۔ ظاہر ہے یہ مقصد پانے کی گنجائش سیدھی سیدھی تاریخ لکھنے کی بجائے سوانح نگاری میں زیادہ تھی اس لیے ان دونوں نے اسے ہی وسیلۂ اظہار بنایا ۔ شبلی نے "سلسلۂ نامور فرمانروائے اسلام" شروع کیا تھا ۔ عبدالرزاق کانپوری نے "سلسلۂ وزرائے اسلام" کی بنیاد رکھی جس کے تحت یحییٰ ، فضل اور جعفر بر مکی کی سوانح عمریوں نے "البرامکہ" کی شکل میں جنم لیا ۔ یہ سیاسی نوعیت کا کام شبلی نے سرسید کی تحریک پر شروع کیا تھا ۔ عبدالرزاق کانپوری کی اس کتاب کے جنم لینے میں بھی سرسید کا حسنِ نظر شامل تھا جنھوں نے مصنف کی نہ صرف ہمت افزائی کی بلکہ اپنے ذاتی کتب خانے سے بھی استفادہ کرنے کی اجازت دی[۱] ۔"

شبلی کی تاریخ نویسی کی ابتدا تک اردو میں تاریخ لکھنے لکھانے کی کوئی باقاعدہ روایت نہ تھی ، انھیں اپنی راہ کا تعین خود کرنا پڑا لیکن عبدالرزاق کانپوری کے تاریخ نویسی شروع کرنے سے پہلے اردو میں تاریخ نویسی کی روایت خاصی مضبوط ہو چکی تھی ، ان کے سامنے کئی راہیں تھیں جن میں انھوں نے شبلی کی دکھائی ہوئی راہ کو سب سے مقدم سمجھا اور اسے اپنا رہنما بنایا ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی سوچ کے ڈانڈے اکثر و بیشتر شبلی کی سوچ کے ڈانڈوں سے آملتے ہیں لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا ان دونوں کی راہ

---

۱ ۔ البرامکہ ، صفحہ ۲۰

ایک ہونے کے باوجود کہیں کہیں عبدالرزاق کانپوری ، شبلی کے ہاتھ سے انگلی چھڑا کر ادھر آدھر اٹکھیلیاں شروع کر دیتے ہیں اور یوں اس راہ سے بھٹک جاتے ہیں جسے شبلی نے مؤرخ کے لیے صحیح منزل تک پہنچنے کے لیے ضروری ٹھیرایا تھا ۔

سب سے پہلی بات تو یہ کہ شبلی نے لاکھ مذہبی آدمی ہونے کے باوجود کبھی تاریخ کا مذہب سے رشتہ ملانے کی کوشش نہیں کی ، جب کہ مولانا عبدالرزاق کانپوری کے نزدیک یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں جن کا ایک دوسرے کے بغیر گزر ان کے نزدیک ناممکن ہے اس سلسلے میں انہوں نے یہ حدیث نقل کرتے ہوئے ''الحدیث و علم التاریخ توامان'' صاف صاف کہا ہے کہ جب تک کوئی محدث ، مؤرخ نہ ہو وہ کسی حدیث کا سچا حال نہیں لکھ سکتا[1] ۔'' مشکل یہ ہے کہ اس بیان میں عبدالرزاق کانپوری نے تاریخ کو جو بلند و بالا مقام دیا ہے وہ عملاً اسے اس مقام پر براجمان رہنے نہیں دیتے بلکہ جہاں کہیں مذہب اور دین کا معاملہ ایک طرف اور تاریخی اصولوں کا معاملہ دوسری طرف ہو ، وہ اول الذکر کا ساتھ دینے میں فخر محسوس کرتے اور اسے اپنے لیے وسیلۂ نجات سمجھتے ہیں ۔ شبلی کے یہاں ایسا نہیں ہوتا ۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کی تاریخ نویسی کی ابتدا کسی حد تک ایک مذہبی ضرورت کے تحت ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود انہوں نے کہیں بھی مذہبی تسکین کی خاطر تاریخ نویسی کے لوازمات اور مقتضیات کو بالائے طاق نہیں رکھا ۔

اسی طرح بعض دوسرے موقعوں پر بھی شبلی اور

---

۱ ۔ البرامکہ ، صفحہ ۳۵

مولانا عبدالرزاق کانپوری نے ایک ہی نوعیت کے معاملات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مختلف طریقے اپنائے ہیں ۔ شبلی کا کہنا تھا اور یہ صحیح بھی تھا کہ دنیا میں وقوع پذیر ہونے والا ہر معاملہ اور ہر واقعہ تاریخ ہے ، اپنی نوعیت کے اعتبار سے خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو ، یا اس کا تعلق کسی بھی ادنٰی سے ادنٰی آدمی ہی سے کیوں نہ نکلتا ہو لیکن مولوی ذکاء اللہ کی طرح عبدالرزاق کانپوری بھی سمجھتے تھے کہ ”نہ تو کوئی ادنٰی اور بازاری درجے کا آدمی مؤرخ ہو سکتا ہے اور نہ اس قسم کا کوئی آدمی تاریخ سے فائدہ اٹھا سکتا ہے [1]۔“ حالانکہ عام مؤرخوں کی طرح تاریخ کے فرائض میں وہ یہ کام بھی شامل سمجھتے تھے کہ تاریخ ماضی کے آئینے میں مستقبل کی راہ سجھاتی ہے چنانچہ انہوں نے ”البرامکہ“ کا اختتام اس دعا پر کیا ہے کہ ”الرحم الراحمین نوجوانانِ قوم کو توفیق دے کہ وہ ماضی سے متاثر ہو کر مستقبل کی فکر کریں۔“ ظاہر ہے یہ نوجوانانِ قوم صرف اعلٰی درجے کے لوگ نہیں ہو سکتے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو شبلی کے سوچنے کا انداز درست تھا اور مولانا عبدالرزاق کانپوری کا کہنا کسی لحاظ سے بھی صحیح نہیں تھا ۔

ان چند فکری اختلافات کے علاوہ اور کہیں عبدالرزاق کانپوری ، اس راہ سے نہیں ہٹتے جو شبلی نے ایک مؤرخ کے لیے ضروری ٹھیرائی تھی ۔ اگر وہ ان دو ایک اختلافات کو بھلا کر صرف شبلی کی دکھائی ہوئی راہ پر چلنا اپنے آپ پر فرض ٹھیراتے تو بہت ممکن تھا کہ ان کی تاریخیں بھی فکری اور فنی اعتبار سے شبلی کی تاریخوں کے ہم پلہ ہو جاتیں ۔

---

۱ ۔ البرامکہ صفحہ ۳۴

اردو کے مورخوں میں مولوی بشیرالدین احمد کا نام بھی ان کی تاریخی تصانیف کی افادیت ، اہمیت اور کیفیت تینوں اعتبار سے بڑی اہم اور بڑی ممتاز حیثیت رکھتا ہے ۔ جیسا کہ اس سے پیشتر ذکر ہوا ہے ، اردو میں تاریخ نویسی کی روایت خاصی پرانی تو ضرور ہے لیکن کچھ ایسی مستحکم نہیں ۔ مورخوں کی اس کمی ، قلت اور کمیت کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ شروع شروع میں ہمارے مورخوں نے اس فن کی جانب کچھ زیادہ توجہ نہیں دی اور دی بھی تو کچھ اس طرح کہ انھوں نے تاریخ اور ادب میں فرق کرنے کے بجائے انھیں ایک ہی پودے کی دو شاخیں قرار دیا ۔ ایک زمانے تک ادب اور تاریخ کو یک جان دو قالب قرار دے کر ایک ہی شے ٹھیرایا جاتا رہا ۔ یہ بات ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو کچھ ایسی غلط بھی نہ تھی کیوں کہ تاریخ اور ادب میں اس اعتبار سے بڑا گہرا رشتہ اور تعلق ہے کہ اگر ایک طرف تاریخ ، ماضی و حال کی نقاب کشا ہوتی ہے تو دوسری طرف ہر ادب اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے یوں ان دونوں کا مطمح نظر ایک دوسرے سے خاصا قریب ہوا لیکن اس قربت کے باوجود یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ دونوں کی منزل ایک ہونے کے باوجود ان کی راہیں جدا جدا ہیں ۔ چنانچہ اگر ان کا ساتھ ہو بھی جائے تو ان دونوں میں قربت پیدا ہونے کے بجائے رد عمل کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ، یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں تاریخ کی جو کتابیں شروع شروع میں لکھی گئی ہیں ۔ وہ تاریخ نویسی کے فن اور معیار پر پوری نہیں اترتیں ۔ اس قلت اور کمی کی دوسری وجہ یہ ٹھیرائی جا سکتی ہے کہ ہمارے مورخوں نے کبھی تاریخ نویسی کو ایک اہم فریضہ سمجھ کر نہیں اپنایا بلکہ اسے

ہمیشہ ایک پارٹ ٹائم جاب یا جزو وقتی کام اور سائڈ بزنس (Side business) کی حیثیت دی ۔ چنانچہ ہمارے یہاں ابتدائی زمانے کے جتنے بھی مورخ ہیں انھوں نے یوں ہی کبھی کبھی محض منہ کا مزا بدلنے کے لیے تاریخ نویسی کی ، ورنہ انھوں نے اپنے لکھنے پڑھنے کے ذوق کی تسکین کے لیے ہمیشہ کسی دوسری صنف ادب کو اپنایا ۔ گنتی کے دو تین لوگ ایسے بھی ہیں جنھوں نے تاریخ نویسی کو ہی اپنا سب سے بڑا فریضہ سمجھا اور اس کی ضروریات و مقتضیات کو بڑے خضوع خشوع کے ساتھ عبادت سمجھ کر پورا کیا ۔ ان میں شاید سب سے اہم نام مولوی بشیرالدین احمد کا ہے ۔

یوں تو مولوی بشیر الدین احمد نے کئی ایسی کتابیں بھی لکھی ہیں جن کا تعلق کلیتاً ادب سے ہے اور کچھ ایسی کتابیں بھی جو خالصتاً ان کے والد یعنی مولوی نذیر احمد کے رنگ میں ہیں لیکن ان کی نظر میں اپنی وقعت ان کی ان کتابوں میں نہیں بلکہ اُن کتابوں میں تھی جن کا تعلق صریحاً تاریخ سے تھا ۔ تاریخ سے متعلق انکے سبھی کارنامے یعنی واقعات دارالحکومت دہلی جو دہلی کی ۱۴۵۰ع قبل مسیح سے ۱۹۱۹ع تک کی تاریخ ہے ، تاریخ بیجانگر اور فرامین سلاطین تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہیں ۔

ان تصانیف کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مولوی بشیر الدین احمد کی نظر میں تاریخ نویسی کے فن کی جملہ مقتضیات اور ضروریات بڑی روشن اور بڑی واضح تھیں ۔

تاریخ نویسی کے لیے جیسا کہ اس سے پیشتر ذکر ہو چکا ہے ۔ ایک اہم ضرورت سادگیٔ بیان ہے کہ تاریخ کا مقصد اولین اپنے پڑھنے والوں کو ماضی و حال کی روشنی میں مستقبل کا

پتہ دینا ہے ، ظاہر ہے اگر اسے سیدھے سادے انداز میں بیان کرنے کے بجائے اس کے بیان کے لیے ایک ایسا انداز اختیار کیا جائے کہ جس کا سمجھنا سہل نہ ہو تو تاریخ کا یہ مقصد بلا شبہ حاصل نہیں ہو سکتا کیوں کہ جب کسی کی سمجھ میں بات آئے گی ہی نہیں تو وہ بھلا اس سے رہنمائی کیا حاصل کرے گا - تاریخ اور سادگیٔ بیان کے رشتے کی اس نزاکت کو سمجھتے ہوئے شبلی نے کہا ہے کہ ''تاریخ اور انشا پردازی کی حدیں بالکل جدا جدا ہیں[۱] -''

شبلی کی طرح مولوی بشیرالدین احمد کی نظر میں بھی انشا پردازی اور تاریخ کا یہ باہم فاصلہ بڑا روشن تھا - وہ بھی سمجھتے تھے کہ انشا پردازی اور کسی شہ کے لیے اہم ہو تو ہو - کم از کم تاریخ نویسی سے قطعاً لگا نہیں کھاتی اسی بات کو دیکھتے ہوئے انھوں نے اپنی کتاب واقعات دارالحکومت دہلی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے : ''یہ ایک تاریخی کتاب ہے ، رنگ آمیزی اور مبالغے سے کوسوں دور[۲] -''

اس سلسلے میں ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے جو کسی کتاب کی اہمیت کا اندازہ صرف اس کا طرز تحریر اور انداز بیان دیکھ کر لگاتے ہیں اُن کا شکوہ کرتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں : ''لوگ سب سمجھتے ہیں کہ تصنیف کی غرض و غایت یہ ہے کہ فصاحت اور بلاغت کا جواب نہ ہو سکے - نفس مضمون میں خواہ کوئی فائدہ یا خوبی ہو یا نہ ہو اُن کو اس سے کچھ مطلب نہیں - کتاب پر نظر غائر ڈالنا اور اس کے مضامین کی تہ

---

۱ - الفاروق صفحہ ۹

۲ - بشیر احمد دہلوی ، واقعات دارالحکومت دہلی ،جلد اول صفحہ ۹

کو پہنچنے سے اُن کو سرو کار نہیں۔ فصاحت اور بلاغت کا معیار یہ قرار دیا گیا ہے کہ اس کی عبارت مسجع و مقفیٰ ہو اور غیر مانوس الفاظ سے ایسی بھری پڑی ہو کہ قدم قدم پر لغت کی مدد درکار ہو۔ جس کے مطالب کج لپیٹ کی وجہ سے معمے اور چیستان سے کم نہ ہوں۔ ایسے لوگ جو صرف لفظوں کے قدردان ہیں اور معنی سے نا آشنا۔ وہ بجائے "موٹے تازے" سیدھے سادے فقرے کے "سنڈ مسٹنڈ ہاتھی کے سے ڈنڈ" مقفیٰ جملے کو سن کر پھڑک اٹھتے ہیں[1]۔"

یہ بات صرف کہنے کی حد تک ہی محدود نہیں بلکہ عملاً بھی مولوی بشیر الدین احمد نے اپنی تصانیف میں برابر یہ کوشش کی ہے کہ کہیں ان کا قلم اس خامی کا شکار نہ ہو، چنانچہ ان کے انداز بیان میں رنگینی نہیں بلکہ سادگی ہے اور یہ ایک مورخ کے لیے بڑے کام کی بات ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان کے یہاں ان کے مزاج میں شامل وہ زباندانی نہیں ملتی جو انہیں اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی بلکہ ان کے یہاں انداز بیان میں کہیں کہیں دہلوی رنگ بھی ہے۔ ایسے موقعوں پر ان کے یہاں حسب موقع استعمال ہونے والے بے شمار محاورے ملتے ہیں لیکن ان کے استعمال کی خاطر وہ کہیں اپنے مقصد کو نظر انداز نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں اگر کہیں زبان میں، ادبیت کا رنگ پایا بھی جاتا ہے تو یہ ادبیت تاریخ نویسی کے فن کو ٹھیس پہنچا کر پیدا نہیں کی جاتی بلکہ اس کا استعمال کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ تاریخ نویسی کی فنی ضروریات اور مقتضیات اپنی جگہ قائم رہیں۔ یہی وجہ ہے

۱۔ بشیر الدین احمد دہلوی، واقعات دارالحکومت دہلی۔ جلد اول صفحہ ۹

کہ ان کے یہاں طویل وقفوں کے لیے یہ رنگ پیدا نہیں ہوتا۔ کہیں کہیں محاورے وغیرہ ملتے تو ہیں لیکن خال خال اور اکا دکا۔ یہی چیز شبلی کے یہاں ہے ان کے مزاج کو انشا پردازی اور شاعری سے جو مناسبت تھی اس کا استعمال ان کے یہاں کہیں کہیں ہوا تو ہے لیکن یہ کبھی بھی تاریخ نویسی کی ضروریات کو ٹھیس پہنچانے کا باعث نہیں بنا۔ اس معاملے میں شبلی اور بشیرالدین احمد کے یہاں کچھ زیادہ فاصلے حائل نہیں بلکہ انشا پردازی اور تاریخ نویسی کے رشتے کی قرابت ان دونوں کی نظر میں ایک سی تھی۔

اسی طرح بعض اور معاملوں میں بھی شبلی اور بشیر احمد کی سوچ اور عمل کے ڈانڈے ایک ہی منزل پر آ ملتے ہیں۔ شبلی نے تاریخیں لکھتے وقت ایک مقصد یہ بھی اپنے پیش نظر رکھا تھا کہ کسی طرح وہ مسلمانوں کے اس احساس کمتری سے بچاؤ کی صورت پیدا کریں جو جنگ آزادی میں شکست کھانے کے بعد ان کے دلوں میں پیدا ہو گیا تھا۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ تاریخ نویسی کو ہمت اور جوش بڑھانے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ تاریخ کے بارے میں بالکل یہی نظریہ بشیر احمد کا بھی تھا وہ بھی سمجھتے تھے کہ "مذہبی ہادیوں کی زبانی سحر انگیز تقریروں سے اتر کر کسی قوم کے مردہ دلوں میں جوش پیدا کرنے اور ہمت بڑھانے کا اگر کوئی عمدہ ذریعہ ہے تو وہ تاریخ ہے اور تاریخ بھی کون سی اُن کے آباء واجداد کی[1]۔"

بشیر الدین احمد نے یہ بات کہی تو ہے لیکن عملاً

۱۔ بشیرالدین احمد دہلوی، واقعات دارالحکومت دہلی۔ جلد اول صفحہ ۳۵

انھوں نے تاریخ کو شاید اس مقصد کے حصول کا اہل نہیں سمجھا یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں تاریخ نویسی کا یہ مقصد اس طرح استعمال نہیں ہوا جیسے شبلی کے یہاں ہوا ہے۔ شبلی نے اس مقصد کے حصول کے لیے اپنی تاریخوں میں ایسے نامور مسلمانوں کے حالات بیان کیے ہیں کہ جنھیں پڑھ کر مسلمانانِ ہند کو تسکین ہوتی ہے کہ وہ ایسے ایسے باعظمت لوگوں کی اولاد ہیں کہ جن کے مقابلے میں اہل یورپ اور ہنود کیا پوری دنیا کی تاریخ سے بہت کم مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ دوسری طرف بشیر الدین احمد کے یہاں ایسا نہیں ہوا ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ تاریخ سے متعلق ان کی تینوں تصانیف کی بنیاد کسی نہ کسی انگریز کے کہنے پر رکھی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے شبلی کی طرح کسی کی عظمت و جبروت دکھانے کے لیے خاص طور پر کوشش نہیں کی۔ اس بات کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یوں تو شبلی اور بشیرالدین احمد اس معاملے میں ہم خیال تھے کہ تاریخ جوش اور جذبہ پیدا کرنے کی مشین ہے لیکن عملاً اس معاملے میں ہم قدم نہ تھے۔

منزل دونوں کی ایک تھی لیکن راہیں جدا جدا تھیں۔ شبلی کی دکھائی ہوئی راہ ٹھیک ان کی منزل تک جا پہنچتی تھی لیکن بشیر احمد کی راہ اپنی منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی تھی۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ بشیر احمد اختصار نویسی کے بے حد قائل ہیں، شاید اسی لیے کہ انھوں نے اپنے لیے ہمیشہ بڑے طویل موضوع کا انتخاب کیا ان کی لکھی ہوئی تینوں تصانیف میں کئی کئی صدیوں کے حالات بیان کیے گئے ہیں جبکہ شبلی نے تاریخ سے متعلق اپنی ہر

کتاب میں صرف ایک شخصیت کا انتخاب کر کے صرف اسی کے زمانے کے حالات بیان کیے اور بعض بعض مرتبہ مثلاً "اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر" کے سلسلے میں تو ایسا بھی ہوا ہے کہ ان کی تصنیف کسی شخص کی پوری زندگی پر محیط بھی نہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں واقعات کا پھیلاؤ ہے۔ اپنی مختصر نویسی کا اندازہ خود بشیر احمد کو بھی تھا چنانچہ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں: "بغیر بیان حالات شاہان دہلی یہ کتاب ناقص اور ادھوری رہ جاتی لہذا میں نے ان حالات کو بہت ہی مختصر طریقے پر بطور اوٹ لینز (Out lines) کے بیان کیا ہے[۱]۔"

یہ ٹھیک ہے کہ مختصر نویسی تاریخ کا ایک اہم تقاضا ہے لیکن اتنا اختصار بھی ضروری نہیں کہ تاریخ سے متعلق کئی واقعات کا بیان رہ جائے اور اگر کچھ بیان ہو بھی تو اتنا مختصر کہ پڑھنے والا کوئی رائے قائم نہ کر سکے یا پوری طرح اسے سمجھ نہ پائے۔ بشیرالدین احمد کے یہاں یہ کمی بارہا کھٹکتی ہے لیکن شبلی کے یہاں ایسا نہیں ہوتا، وہ بھی اختصار کو تاریخ کی ایک اہم ضرورت سمجھتے تو ہیں لیکن اس اختصار سے اعتدال کی حد تک کام لیتے ہیں۔

اسی طرح بعض دوسرے معاملات میں بھی بشیر احمد نے شبلی سے ہم خیالی کا اظہار تو کیا ہے لیکن ان کے ہم قدم نہیں ہوئے۔ شبلی کے یہاں جیسا کہ اس سے پیشتر بھی بیان ہوا ہے ایک خاص بات ہے کہ وہ تاریخ کی بے کیفی دور کرنے کے لیے بیچ بیچ میں کہیں کہیں اپنے موضوع سے متعلق

۱۔ بشیرالدین احمد، واقعات دارالحکومت دہلی، جلد اول، صفحہ ۸۔

ایسے دل چسپ واقعات بیان کرتے جاتے ہیں کہ ان کے یہاں تاریخ میں کچھ اور دل چسپی اور دل کشی پیدا ہو جاتی ہے - لیکن یہ یاد رہے کہ یہ ان کے یہاں کبھی نہیں ہوتا کہ وہ ان قصوں کے بیان کی خاطر کبھی اپنے مقصد اور اپنی منزل سے بھٹک جائیں ، وہ ایسے قصے بیان تو کرتے ہیں لیکن صرف اس حد تک کہ وہ تاریخ کو دل چسپ اور دل کش تو بنائیں لیکن اس کے فنی تقاضوں کو ٹھیس نہ پہنچائیں - دوسری طرف بشیر احمد بھی تاریخ کو دل چسپ اور دل کش بنانے کے حق میں تو ہیں لیکن ان کی نظر میں یہ دل کشی اور دل چسپی صرف زیادہ سے زیادہ معلومات کی فراہمی میں ہے ، اس طرف انھوں نے ایک جملے میں نشاندہی کی ہے - واقعات دارلحکومت دہلی کے بارے میں کہتے ہیں :

"میں نے بھی اس کتاب پر اپنی جان لڑا دی ہے
اور کوئی دقیقہ اس کے مکمل اور دل چسپ بنانے
کا آٹھا نہیں رکھا [۱] -"

تاریخ اور سچائی کا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ تاریخ قصے کہانی کا نہیں بلکہ حقیقت کے بیان کا دوسرا نام ہے - تاریخ مجموعہ ہے حقائق کے بیان کا - اگر ان حقائق اور دنیا میں پیش آنے والے واقعات میں لکھنے والا اپنی طرف سے ذرا بھی کمی بیشی کردے تو وہ تاریخ نہیں رہتی - اسی بات کی وضاحت کرتے ہوئے شبلی نے کہا ہے کہ اگر مؤرخ کو کوئی بات سچ سچ لکھنے کے لیے اپنے مذہبی عقائد بھی خیر باد کرنا پڑیں تو اسے توقف نہیں کرنا چاہیے اور یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے

---

۱ - بشیرالدین احمد ، واقعات دارالحکومت دہلی ، جلد اول،صفحہ ۹ -

عملاً بھی ایسا ہی کیا ہے ۔ شبلی نے جتنے بھی لوگوں کی سوانح حیات یا دوسرے لفظوں میں تاریخ لکھی ہے وہ ان سبھی کے عقیدت مند تھے ، اور انھوں نے ان کا انتخاب اپنی پسند کے ایک خاص معیار کو سامنے رکھتے ہوئے کیا تھا لیکن اس عقیدت کے باوجود انھوں نے کہیں اپنی خوش اعتقادگی کو تاریخ نویسی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنایا بلکہ اگر ایک طرف انھوں نے اپنے چنے ہوئے ناموروں کی باعظمت زندگی کے گرا نمایہ کارنامے بیان کیے ہیں تو دوسری طرف اگر انھیں ان کی کوئی خامی دکھائی دی ہے تو بلا جھجک اس کا بھی ذکر کیا ہے کیوں کہ ان کے نزدیک سچ بات کہنا مورخ کے لیے ایمان کا درجہ رکھتی ہے ، دوسری طرف مولوی بشیر الدین احمد نے بھی تاریخ اور سچائی کا یہی رشتہ بتاتے ہوئے تاریخ کو غلط بیانی اور طوطیا بندی سے نفور قرار دیتے ہوئے واقعات کے بلا کم و کاست بیان کا نام دیا ہے[1] ۔

لیکن تاریخ اور سچائی کے رشتے کی اس نزاکت کو سمجھنے کے باوجود انھوں نے کسی حد تک اس طرف سے کوتاہی برتی ہے اور بعض ایسے واقعات کی درستی ضروری نہیں سمجھی جو بعض متعصب مورخوں کے طفیل غلط طور پر مشہور ہو گئے تھے شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ایک اچھے مؤرخ ہونے کے باوجود مولوی بشیر احمد کو تحقیق و جستجو سے کوئی خاص مناسبت یا یوں کہہ لیجیے کہ دلچسپی نہ تھی ۔ کسی سچی بات کو خواہ وہ کتنی ہی سچی کیوں نہ ہو منہ پر کہنا بڑے دل گردے کا کام ہے اور یہ کام صرف وہ

---

۱ ۔ بشیر احمد ، واقعات دارالحکومت دہلی ، جلد اول صفحہ ۱۰۳۶

شخص سر انجام دے سکتا ہے جسے اپنی جان سے کچھ ایسی دل‌چسپی نہ ہو ۔ شبلی اور بشیر احمد دونوں کا زمانہ سیاسی اعتبار سے مسلمانان ہند کے لیے بڑا نازک زمانہ تھا ۔ مسلمان جنگ آزادی میں شکست کھانے کے بعد بڑی کشمکش کی حالت میں مبتلا تھے ، نہ کوئی نام لیوا تھا نہ پرسان حال ۔ انگریز حکمران اگر ایک طرف انھیں اپنا سب سے بڑا دشمن ٹھیراتے تھے تو دوسری طرف ہندو ہم وطن ان سے علیحدہ علیحدہ رہنے کو نئے حکمرانوں سے قربت بڑھانے کا ذریعہ سمجھتے تھے ۔ یوں مسلمان نہ ادھر کے رہے تھے نہ ادھر کے ، بات کہنا بھی چاہتے تو کس سے ؟ یہ سب کچھ تو تھا ہی اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ نئے حکمران ایک طرف اور ہندو ہم وطن دوسری طرف برابر اس کوشش میں بھی تھے کہ مسلمانوں کو سیاسی حقوق کے ساتھ ساتھ ان کی تہذیبی اور معاشرتی روایات سے بھی محروم کر دیا جائے ، اسی نقطے کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھوں نے مسلسل یہ کوشش کی کہ ان کی تاریخ کو ایک نیا رنگ دے کر ایک ایسی شکل میں ڈھال دیں کہ خود مسلمان بھی اسے دیکھ کر شرمائیں ۔ سیاسی مشکلات اور مصائب کو دیکھا جائے تو ان کی ان غلط مشہور کردہ باتوں کا جواب دینا بڑے جان جوکھم کا کام تھا! لیکن شبلی کو اپنی جان سے زیادہ اپنی تہذیبی اور معاشرتی روایات عزیز تھیں چنانچہ انھوں نے اس کام کو سرسید کی شہہ پر اپنایا اور تحقیق و تدقیق سے ان باتوں کا بڑی محنت سے جواب دیا جو غیر مسلموں نے مسلمانوں کے خلاف مشہور کی تھیں ۔ دوسری طرف مولوی بشیر احمد بھی تاریخ کو سچ کا مرقع بنانے کے خواہش مند تو تھے لیکن اپنے مزاج کی تحقیق کی طرف

مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے یہ اہلیت نہ رکھتے تھے کہ وہ ان باتوں کا جواب دیتے۔ انھوں نے بعض بعض جگہ اس سلسلے میں کوشش تو کی ہے اور بعض واقعات کے بارے میں کئی مختلف الخیال مورخوں کے بیانات یکجا بھی کیے ہیں لیکن انھوں نے ان بیانات کو سامنے رکھ اپنی کوئی ذاتی رائے قائم نہیں کی یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ تحقیق کی طرف ان کی طبیعت کچھ ایسی مائل نہ تھی۔ یہ چیز بھی ان کے مقابلے میں مؤرخ کی حیثیت سے شبلی کی بڑائی کی نشاندہی کرتی ہے۔

انسان مر جاتے ہیں اور ان کے پیچھے ان کے چھوڑے ہوئے نقش، ان کی چھوڑی ہوئی نشانیاں باقی رہ جاتی ہیں، یہی نقش اور یہی نشانیاں آئندہ آنے والے مؤرخ کو ماضی کا پتہ دیتی ہیں اس بات کو سمجھتے ہوئے تاریخ کے نبض شناسوں نے بسااوقات شخص اور شخصیت کے مقابلے میں اس سے متعلق تہذیبی اور معاشرتی روایات کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ شبلی نے بھی کہ ان کی نظر میں تاریخ نویسی کی ضروریات بڑی روشن اور واضح تھیں، اس نزاکت کو سمجھتے ہوئے اپنی تاریخوں کو صرف شخص اور شخصیت تک محدود اور پابند نہیں رکھا حالانکہ انھوں نے تاریخ نویسی کا ذریعہ بنایا ہے سوانح نگاری کو۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تاریخیں ایک مرکز کے گرد گھومنے کے بجائے ادھر اِدھر پھیلاؤ کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ مولوی بشیر احمد کی نظر میں بھی یہ بات بڑی واضح تھی چنانچہ انھوں نے بھی اپنی تاریخوں میں زمانے کے معاشرتی اور تہذیبی نقوش کو شخص اور شخصیت سے زیادہ اہمیت دی ہے، اس معاملے میں وہ اور شبلی ہم خیال ہونے کے باوجود مختلف الخیال بھی ہیں کیونکہ شبلی سمجھتے تھے کہ ان تہذیبی و معاشرتی

روایات کو جنم خود اشخاص دیتے ہیں اور یوں ایک شخص کی اہمیت معاشرتی اور تہذیبی واقعات کے بیان کے مقابلے میں بڑھ جاتی ہے کہ ان تہذیبی اور معاشرتی روایات کو وسیلہ بنایا جاتا ہے جنم دینے والے شخص تک پہنچنے کے لیے۔ اگر وہ شخص ہی نہ ہو تو ان روایات کا پتہ کہاں ملے؟ لیکن بشیر احمد نے اشخاص سے زیادہ اُن سے متعلق روایات کو اہمیت دی ہے ، ان کے یہاں ان روایات کے مقابلے میں ان کے معماروں کو ثانوی حیثیت حاصل ہے ، یہ چیز بھی شبلی اور بشیر احمد کے یہاں وجہ اختلاف قرار دی جاسکتی ہے - اور یہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ شبلی کا مرتبہ بشیر احمد سے بہر طور بلند تھا ۔ کیونکہ شبلی نے اپنی تاریخوں میں ہر شے اور ہر چیز کو اس کے مرتبے اور منصب کے مطابق اہمیت دی ہے ، وہ خوب سمجھتے ہیں کہ کہاں اور کب کسی چیز سے کتنا اور کس حد تک کام لینا اور اُسے کیا اہمیت دینا ہے بشیر احمد کی نظر میں یہ بات پوری طرح واضح نہیں تھی - یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے بعض کم اہم چیزوں کا ذکر تو بڑی تفصیل سے کیا ہے اور بعض بے حد اہم چیزوں کو اُن کی اہمیت کے باوجود انھوں نے کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی - یہ چیز بھی مؤرخ کی حیثیت سے اُن کے مقابلے میں شبلی کا مرتبہ بلند اور ممتاز بناتی ہے -

مختصر یہ کہ شبلی کے تاریخی اکتسابات کا جائزہ لینے اور معاصر مورخین سے موازنہ و مقابلہ کرنے کے بعد اب اس امر پر مزید زور دینے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ معاصر تاریخ نویسوں میں شبلی کا مرتبہ کیا ہے - وہ اردو کے مورخ اول ہی نہیں تاریخ نگاری کی ایک منزلِ بلند اور اس کا عین مقصود و معیار بھی ہیں -

---

کتابیات

۱ - آزاد ، محمد حسین ، دربار اکبری ، بار اول ، ۱۸۹۸ع ،
دارالاشاعت لاہور -
۲ - آفتاب احمد صدیقی ، شبلی ایک دبستان ، بار اول ، سنہ اشاعت
درج نہیں ، مکتبہ عارفین ڈھاکہ -
۳ - اعجاز حسین ، ڈاکٹر ، مختصر تاریخ ادب اردو ، بار اول ،
۱۹۵۶ع اکیڈمی لائبریری لاہور -
۴ - اعظمی ، عبداللطیف ، شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں ،
بار اول ۱۹۴۵ع ، شبلی اکادمی دہلی -
۵ - اکرام ، شیخ محمد ، شبلی نامہ ، بار اشاعت درج نہیں ،
سنہ اشاعت درج نہیں ، تاج آفس بمبئی -
۶ - اکرام ، شیخ محمد ، موج کوثر ، بار اشاعت درج نہیں ،
سنہ اشاعت درج نہیں ، فیروز سنز لاہور -
۷ - الطاف فاطمہ ، اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا ، بار اول ،
۱۹۶۱ع اردو اکیڈمی سندھ کراچی -
۸ - امین زبیری ، محمد ، ذکر شبلی ، بار اول ، ۱۹۵۳ع ،
مکتبہ جدید لاہور -
۹ - امین زبیری ، محمد ، تبصرۂ حیات شبلی ، بار اشاعت درج نہیں ،
۱۹۴۶ع ، سنٹرل انڈیا پریس بھوپال -
۱۰ - برنی ، ضیاء الدین ، ذکا اللہ ترجمہ ، بار اول ، ۱۹۵۲ع ،
تعلیمی مرکز کراچی -
۱۱ - بشیر الدین احمد ، مولوی ، واقعات دارالحکومت دھلی ، بار
اول ، ۱۹۱۹ع ، شمسی مشین پریس آگرہ -

۱۲ - **بشیرالدین احمد ، مولوی** ، فرامین سلاطین ، بار اول ، ۱۹۲۶ع ، دلی پرنٹنگ ورکس دلی -

۱۳ - **بلگرامی ، سید علی** ، تمدن ہند ، بار اول ، ۱۹۱۳ع ، مطبع شمسی آگرہ -

۱۴ - **بلگرامی ، سید علی** ، تمدن عرب ، بار اشاعت درج نہیں ، ۱۹۶۰ع ، مقبول اکیڈمی ، لاہور -

۱۵ - **حالی ، الطاف حسین** ، النعمان (کلیات نثر حالی) ، زیر اشاعت ، مجلس ترقی ادب لاہور -

۱۶ - **حامد حسن قادری** ، داستان تاریخ اردو ، بار دوم ، ۱۹۵۷ع لکشمی نرائین اگر وال آگرہ -

۱۷ - **حبیب اللہ خان شروانی ، نواب** ، الفاروق ، (مقالات شروانی) بار اول ، ۱۹۴۶ع ، شروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ -

۱۸ - **حبیب اللہ خان شروانی ، نواب** ، مرحوم علامہ شبلی ، (مقالات شروانی) بار اول ، ۱۹۴۶ع ، شروانی پرنٹنگ پریس ، علی گڑھ -

۱۹ - **خورشید الاسلام** ، شبلی ، (تنقیدیں) بار اشاعت درج نہیں ، ۱۹۵۷ع ، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ -

۲۰ - **ذکا اللہ ، مولوی** ، تاریخ ہندوستان جلد اول ، بار دوم ، سنہ اشاعت درج نہیں ، مطبع انسٹی ٹیوٹ گزٹ -

۲۱ - **ذکا اللہ ، مولوی** ، تاریخ ہندوستان جلد سوم ، بار اول ، سنہ اشاعت درج نہیں ، مطبع انسٹی ٹیوٹ گزٹ -

۲۲ - **ذکا اللہ ، مولوی** ، تاریخ ہندوستان جلد چہارم ، بار اول ، ۱۹۱۷ع ، مطبع انسٹی ٹیوٹ گزٹ -

۲۳ - **ذکا اللہ ، مولوی** ، تاریخ ہندوستان جلد پنجم ، بار اول ، ۱۹۱۸ع ، مطبع انسٹی ٹیوٹ گزٹ -

۲۴ - **ذکا اللہ ، مولوی** ، تاریخ ہندوستان ، جلد ہفتم ، بار اول ، سنہ اشاعت درج نہیں ، مطبع انسٹی ٹیوٹ گزٹ -

۲۵ - **ذکا اللہ ، مولوی** ، تاریخ ہندوستان جلد ہشتم ، بار اول ، ۱۹۱۷ع ، مطبع انسٹی ٹیوٹ گزٹ -

۲۶ - **سخی احمد ہاشمی** ، شبلی کا ذہنی ارتقاء ، مخطوطہ - مخزونہ ، کتب خانہ پروفیسر محمد طاہر فاروق ، پشاور
۲۷ - **سرور** ، آل احمد ، تنقید کیا ہے ، پہلی پاکستانی اشاعت ، سنہ ندارد ، اردو اکیڈمی سندھ کراچی -
۲۸ - **سلیمان ندوی** ، سید ، حیات شبلی ، بار اول ، ۱۹۴۳ع ، مطبع معارف اعظم گڑھ -
۲۹ - **سید احمد خان** ، سر ، سر کشیٔ ضلع بجنور ، سنہ ندارد ، اشاعت درج نہیں سلیمان اکیڈمی کراچی -
۳۰ - **سید احمد خان** ، سر ، اسباب بغاوت ہند ، سنہ ندارد ، سلیمان اکیڈمی کراچی -
۳۱ - **شاہ علی** ، ڈاکٹر سید ، اُردو میں سوانح نگاری ، بار اول ، ۱۹۶۱ع گلڈ پبلشنگ ہاؤس کراچی -
۳۲ - **شبلی** ، **الغزالی** ، سنہ ندارد ، شیخ مبارک علی لاہور -
۳۳ - **شبلی** ، **الفاروق** ، سنہ اندرد ، شیخ غلام علی لاہور -
۳۴ - **شبلی** ، **المامون** ، سنہ ندارد ، شیخ مبارک علی لاہور -
۳۵ - **شبلی** ، **النعمان** ، سنہ ندارد ، سنگ میل پبلیکشنز لاہور -
۳۶ - **شبلی**، **انتخاب مقالات شبلی**، بار اول، ۱۹۶۰ع، اکیڈمی لائبریری لاہور -
۳۷ - **شبلی** ، **اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر** ، ۱۹۶۱ع ، اکیڈمی لائبریری لاہور -
۳۸ - **شبلی**، **باقیات شبلی** ، بار اول، ۱۹۶۵ع، مجلس ترقی ادب لاہور-
۳۹ - **شبلی** ، **بدء الاسلام**، مترجمہ میمونہ سلطان شاہ، بار اشاعت درج نہیں ، ۱۳۴۳ھ ، مطبع معارف اعظم گڑھ -
۴۰ - **شبلی** ، **خطبات شبلی** ،
۴۱ - **شبلی**، **رسائل شبلی**، بار اول، ۱۸۹۸ع، مطبع دارالعلوم علی گڑھ -
۴۲ - **شبلی** ، **سوانح مولانا روم** ، پہلی پاکستانی اشاعت ، شیخ مبارک علی لاہور -

۴۳ - شبلی ، سیرۃ النبی ، جلد اول ، بار ششم، سنہ اشاعت درج نہیں، شیخ مبارک علی لاہور -

۴۴ - شبلی ، سیرۃ النبی ، جلد دوم ، بار پنجم ، مطبع معارف اعظم گڑھ -

۴۵ - شبلی ، شعرالعجم ،

۴۶ - شبلی ، کلیات شبلی، بار سوم، ۱۹۴۰ء مطبع معارف اعظم گڑھ -

۴۷ - شبلی ، مکاتیب شبلی ، جلد اول ، بار دوم ، ۱۹۲۸ء مطبع معارف اعظم گڑھ -

۴۸ - شبلی ، مکاتیب شبلی ، جلد دوم ، بار دوم ، ۱۹۲۷ء ، مطبع معارف اعظم گڑھ -

۴۹ - شبلی، مقالات شبلی، جلد اول، باراشاعت درج نہیں، ۱۹۵۴ء ، مطبع معارف اعظم گڑھ -

۵۰ - شبلی ، مقالات شبلی ، جلد چہارم ، بار سوم ، ۱۹۵۶ء ، مطبع معارف اعظم گڑھ -

۵۱ - شبلی ، مقالات شبلی ، جلد پنجم ، بار دوم ، ۱۹۵۵ء ، مطبع معارف اعظم گڑھ -

۵۲ - شبلی ، مقالات شبلی ، جلد ششم، بار اشاعت درج نہیں، ۱۹۵۱ء، مطبع معارف اعظم گڑھ -

۵۳ - شرر ، مولانا عبدالحلیم ، حسن بن صباح ، اشاعت اور سنہ درج نہیں ، حافظ محمد دین لاہور -

۵۴ - شرر ، مولانا عبدالحلیم، تاریخ اسلام دوم ،بار اشاعت درج نہیں، ۱۹۲۶ء ، جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن -

۵۵ - شرر ، مولانا عبدالحلیم ، تاریخ ارض مقدس ، بار اول، ۱۹۳۱ء، دلگداز پریس لکھنؤ -

۵۶ - شرر ، مولانا عبدالحلیم، مضامین شرر ، بار اشاعت درج نہیں ، سنہ اشاعت درج نہیں ، گیلانی پریس ، لاہور -

۵۷ - ضیا احمد رضوی ، سید ، تاریخی ناول تقسیم کے بعد ، مخطوطہ مخزونہ ، پنجاب یونیورسٹی لائبریری -

۵۸ - **طفیل احمد منگلوری ، سید** ، مسلمانوں کا روشن مستقبل بار چہارم ، ۱۹۴۲ع ، نظامی پریس بدایوں -
۵۹ - **عبدالسلام خورشید** ، شبلی، بار اول، ۱۹۵۲ع،قومی کتب خانہ لاہور -
۶۰ - **عبداللہ ، ڈاکٹر سید** ، (طیف نثر) بار اول ، ۱۹۶۴ع نذر سنز کراچی ، لاہور -
۶۱ - **عبداللہ ، ڈاکٹر سید** ، سرسید اور ان کے رفقا ، بار دوم ، ۱۹۶۵ع ، مکتبہ کارواں لاہور -
۶۲ - **عبیداللہ خان ، ڈاکٹر**، مقالات یوم شبلی ، بار اول ، ۱۹۶۱ع ، اردو مرکز لاہور -
۶۳ - **محمد مہدی**، شبلی، سنہ ندارد ، بشیر پاشا سیریز -
۶۴ - **مہدی افادی** ، افادات مہدی ، بار چہارم ، ۱۹۴۹ع ، مبارک علی لاہور -
۶۵ - **نذیر احمد دہلوی** ، تاریخ تاج پوشی ، بار اول ، ۱۹۰۳ع ، دہلی -
۶۶ - **نذیر احمد دہلوی** ، مصائب غدر ، بار اول ، ۱۸۶۳ع ، مطبع نول کشور لکھنؤ -
۶۷ - **وقار عظیم ، پروفیسر سید** ، فن اور فن‌کار ، بار اول ، ۱۹۶۶ع، اردو مرکز لاہور -
۶۸ - **یوسفی ، سعد حسن خان** ، مقدمہ تاریخ ابن خلدون ، ترجمہ ، اصح المطابع و کار خانہ تجارت کتب کراچی -

متفرق مقالات و مضامین :

۶۹ - **ادبی دنیا** - لاہور، جلد ۱۰ ، ۱۹۴۷ع ، مولانا شبلی ایک علیگ شاگرد کی نظر میں ، سید طفیل احمد -
۷۰ - **ادیب** - علی گڑھ ، جولائی ۱۹۱۱ع ، علامہ شبلی نعمانی ، جان ملکم -
۷۱ - **ادیب** - علی گڑھ ، شبلی نمبر ، تمام مضامین -

۷۲ - **افکار** - کراچی ، سالنامہ ۱۹۶۸ء ، ذکا اللہ بحیثیت مورخ ، اختر وقار عظیم -

۷۳ - **اقبال** - لاہور ، اپریل ۱۹۶۸ء، مورخ شبلی ، اختر وقار عظیم -

۷۴ - **الناظر** - لکھنؤ ، ۱۹۰۸ء ، اردو کا بہترین انشا پرداز شبلی ، مولانا سعید انصاری -

۷۵ - **الناظر** - لکھنؤ ، دسمبر ۱۹۱۴ء ، شبلی کی یاد میں ، مولانا عبدالحلیم شرر -

۷۶ - **الناظر** - لکھنؤ ، اپریل مئی ۱۹۲۵ء ، اردو کے عناصر اربعہ میں علامہ شبلی کا درجہ ، مولانا سعید انصاری -

۷۷ - **برگ گل** - کراچی ، سرسید نمبر ، تمام مضامین -

۷۸ - **خاور** - ڈھاکہ ، نومبر ۱۹۵۳ء ، شبلی کا اسلوب نگارش ، ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی -

۷۹ - **ریڈیائی تقریر** ، ۸ اپریل ۱۹۶۷ء ، سرسید بحیثیت مورخ ، اختر وقار عظیم -

۸۰ - **ریڈیائی تقریر** - ٦ مئی ۱۹۶۷ء ، اردو کا مورخ اول شبلی ، اختر وقار عظیم -

۸۱ - **ریڈیائی تقریر** - ۱۷ اکتوبر ۱۹۶۷ء، محمد حسین آزاد بحیثیت مورخ اختر وقار عظیم -

۸۲ - **ساقی** - کراچی ، فروری ۱۹۶۸ء ، یاد گار شبلی ، نصیر الدین ہاشمی -

۸۳ - **صبا** - حیدر آباد ، شبلی نمبر ، تمام مضامین -

۸۴ - **علی گڑھ میگزین** - علی گڑھ نمبر ، تمام مضامین -

۸۵ - **غیر مطبوعہ** - اردو میں تاریخ نویسی سرسید سے شرر تک ، اختر وقار عظیم -

۸۶ - **غیر مطبوعہ** - سیاست داں شبلی ، اختر وقار عظیم -

۸۷ - **ماہ نو** - کراچی ، جون ۱۹۶۷ء ، سرسید بحیثیت مورخ ، اختر وقار عظیم -

۸۸ - ماہ نو - کراچی ، نومبر ۱۹۶۷ع ، شبلی ایک عظیم مورخ ، اختر وقار عظیم -

۸۹ - ماہ نو - کراچی، اپریل ۱۹۶۸ع، ذکا اللہ کی تاریخ ہندوستان ، اختر وقار عظیم -

۹۰ - ماہ نو - کراچی، اگست ۱۹۵۲ع، اردو سوانح نگاری سرسید کے زمانے میں ، ڈاکٹر سید عبداللہ -

۹۱ - مجلس - لاہور، جون ۱۹۶۸ع، اردو کا ایک مورخ - عبدالرزاق کانپوری ، اختر وقار عظیم -

۹۲ - معارف - اعظم گڑھ ، مارچ اپریل ۱۹۲۸ع، شبلی کا نظریہ تاریخ ڈاکٹر سید عبداللہ -

۹۳ - مہر نیم‌روز - کراچی ، نومبر ۱۹۵۶ع ، شبلی و حالی کا ایک تقابلی مطالعہ ، ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی -

۹۴ - نقوش - لاہور ، شخصیات نمبر جنوری ۱۹۵۶ع ، شبلی ، صباح الدین عبدالرحمٰن -

۹۵ - نگار - کراچی، اکتوبر ۱۹۶۶ع ، علامہ شبلی مورخ کی حیثیت میں ، ضیاء الدین فاروقی -

۹۶ - نگار - لکھنؤ، جولائی ۱۹۵۶ع ، مولانا شبلی علی گڑھ سے پہلے ، اور بعد ، مفتون احمد -

۹۷ - نگار - لکھنؤ ، جولائی ۱۹۵۶ع ' حالی اور شبلی سوانح نگار کی حیثیت سے ، قسط اول ، ڈاکٹر سید شاہ علی -

۹۸ - نگار - لکھنؤ ، اگست ۱۹۵۶ع ، ایضاً ، قسط دوم ، ڈاکٹر سید شاہ علی -

۹۹ - نگار - لکھنؤ ، ستمبر ۱۹۵۶ع ، ایضاً ، قسط سوم ، ڈاکٹر سید شاہ علی -

۱۰۰ - نئی قدریں - حیدر آباد، نومبر ۱۹۵۶ع، شبلی بحیثیت سوانح نگار، خواجہ مقبول احمد -

۱۰۱ - ہمایوں - لاہور ، مئی ۱۹۳۰ع ، شبلی بحیثیت مصنف ، میاں بشیر احمد -

1. Abdul Hamid. Dr. *A Brief Survey of Muslim Separatism in India*, Ed. First 1967. Oxford University Press Lahore.

2. Abdullah, Dr. S.M. *Shibli Nomani* (*the veteran Muslim Biographer*) Ed. First, Iqbal Academy, Lahore.

3. Burckhardt, Jacob and Harry Zohn. *Judgement of History and Historians*, Ed. First 1958. Beacan Press America.

4. Carlyle, Thomas. *Heroes, Hero worship and Heroic*, Ed. First 1945. London.

5. Carr, E. H. *What is History*, Ed. Third 1965. Penguin Books. London.

6. Childe. *What is History*, Ed. First 1953. Henry Schuman New York.

7. Croce, Benedetto *Theory and History of Historiography*, Ed. First (Eng.) 1921 George G. Harrap and Co., London.

8. Dutt, R.P. *Problems of Contemporary History*, Ed. First 1963. Lawrence and Wishart, London.

9. East, W. Gordon *The Geography Behind History*, Ed. Thirteenth 1:65. Thomas Nelson, London:

10. Galbraith, V.H. *An Introduction to the Study of History*, Ed. First 1964. C.A. Watts London.

11. Gustavson. G. *A Preface to History*, Ed. First 1954. McGraw Hill, New York.

12. Hanning, Robert W. *The Vision of History*, Ed. First 1966. Columbia Univ. Press Columbia.

13. Hexter, J.H. *Reappraisals in History*, Ed. Third 19 3. Longmans, London.

14. Higham John. *History*, Ed. First 1965. Prentice Hall, New York.

15. Jaffer, S.M. *What is History*, Ed. First 1961. Sadiq Sons. Peshawar.

16. Jaffar, S. M. *Role of Research in History*, Ed. First 1961. Sadiq Sons, Peshawar.

17. Jamil-ud-Din Ahmad. *Early Phase of Muslim Political Movement*, Ed. Second 1966. Publishers United Lahore.

18. Kent, Sherman. *Writing History*, Ed. First 1941. Appleton-Century Crofts, INc. New York.

19. Nicholas Berdyaev. *The Meaning of History*, Ed. First Medridian 1962. The World Publishing Company, New York.

20. Phillips, C.H. *Historians of India, Pakistan and Ceylon*, Ed. First 1961. Oxford University Press, London.

21. Powick,F.M. *Modern Historians and the Study of History* Ed. First 1955. Odhams Watford.

22. Qureshi, I.H. *The Struggle for Pakistan*, Ed. First 1965 University of Karachi.

23. Razi Wasti, S. *Lord Minto and the Indian Nationalist Movement* Ed. First 1964. Oxford Univ. Press, London.

24. Rickman H.P. *Meaning in History* Ed. First 1961. Allen and Unwin London.

25. Teggart, Frederick J. *Theory and Processes of History*, Ed. Second 1960. University of California.

26. Toynbee, Arnold. *An Historian's Approach to Relegion*, Ed. Third 1957. Oxford Univ. Press, New York.

27. Walsh, W.H. *Philosophy of History*, Ed. First 1960 (American Edition) Harper and Bros. New York.

اسماء الرجال

اسماء الکتب

اقبال ــ شاعر اور فلسفی

از

پروفیسر سید وقار عظیم

اقبال ــ شاعر اور فلسفی جسے تصنیفات لاہور نے شائع کیا ہے ، اقبال پر سید وقار عظیم کے سترہ مضامین کا مجموعہ ہے ۔ خصوصیت ان مضامین کی یہ ہے کہ ان میں روائیتی تنقید سے کام نہیں لیا گیا بلکہ مصنف کی ذات نے ایک عمر کے مطالعۂ اقبال کے بعد جو نتائج مرتب کیے ہیں ، ان کا عکس ان مضامین میں موجود ہے ۔ شعر اقبال سے مصنف نے جو روحانی لذت ، سرور اور روشنی حاصل کی ہے ، یہ مضامین اس کا مظہر بھی ہیں ۔

اچھی اور تخلیقی تنقید ، شعر کی روایتی پرکھ نہیں ہوتی بلکہ شعر اور حساس قاری کے درمیان جو رشتہ قائم ہوتا ہے ، اس کا پر لطف بیان ہوتی ہے ۔ یوں تو اس کتاب میں اقبال کی حکمت فرزانہ بھی ہے لیکن دراصل یہ کتاب اس شاعرانہ کیفیت کے حسن و خوبی کا بیان ہے جو شعر اقبال کا جادو ہے اور جو قاری کے دل کے راستے سے اس کے دماغ پر تسلط حاصل کرتا ہے ۔"

(اعجاز حسین بٹالوی ، تبصرہ : ریڈیو پاکستان ، لاہور)

طباعت خوش نما ٹائپ میں ۔ قیمت بارہ روپے

تصنیفات، لاہور